یکے از مطبوعات آزاد صدی

اردو کا ادیبِ اعظم

مولانا ابوالکلام آزادؒ کے حسنِ انشا اور مرقعِ سیرت پر ایک نظر

مولانا عبدالماجد دریابادی

اردو کا ادیبِ اعظم

مولانا ابوالکلام آزادؒ کے حسنِ انشا اور مرقعِ سیرت پر ایک نظر

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ

ادارہ
تصنیف و تحقیق
پاکستان
۱۸.۸۶۔ کراچی ۳۲

تالیف : اردو کا ادیب اعظم
مصنف : مولانا عبدالماجد دریابادی
مرتب : ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری
ناشر : ادارہ تصنیف و تحقیق پاکستان۔ کراچی
طابع : المخزن پرنٹرز (مکتبہ رشیدیہ) پاکستان چوک۔ کراچی
اشاعت اول : فروری ۱۹۸۶ء
تعداد : پانچ سو۔
قیمت : 25/- روپے

ملنے کے پتے

مکتبۂ شاہد ——— علی گڑھ کالونی۔ کراچی ۲۱

پاک اکیڈمی ——— مسجد باب الاسلام۔ آرام باغ کراچی

معیارِ ادب ——— ۱۲۶/۵۔ ڈی/۵، نیو کراچی

سُنّی پبلی کیشنز ——— الوہاب مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

بہ تقریب

صد سالہ یوم پیدائش

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ

وطن آبائی

دہلی مرحوم (پنڈت کا کوچہ)

سلام علی نجد، ومن حل بالنجد

وطن مادری، مدینہ طیبہ

دارم دلے گرداں کہ من قبلہ نما می خوانمش
روسوئے ابرویش کند ہر چند می گردانمش

ولادتِ باسعادت

ذوالحجہ ۱۳۰۵ھ مطابق اگست ۱۸۸۸ء

بمقام مکہ معظمہ زاد اللہ شرفا وکرامۃ، محلہ قدوۃ، متصل باب السلام

بوادٍ غیر ذی زرع عند بیتک المحرم

وفاتِ حسرت آیات

۲ شعبان المعظم ۱۳۷۷ھ مطابق ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء بروز ہفتہ

بہ مقام دہلی (دارالحکومت ہند)

آزاد نیشنل کمیٹی پاکستان

فہرست مضامین

پیش لفظ

مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبدالماجد دریا بادی، دونوں معاصر تھے، ہم ذوق تھے، ہم سفر تھے، ہم مسلک تھے۔ اگرچہ یہ سفر طیِ مسافت کا اور مسلک کوئی فقہی اور کسی خاص طریقت وتصوف کا نہ تھا۔ انھوں نے کئی تحریکوں میں ساتھ ساتھ حصہ لیا تھا۔ ترکِ موالات اور تحریکِ خلافت میں دونوں شریک تھے۔ اور کئی سیاسی، تعلیمی، تہذیبی، معاشرتی، اصلاحی مقاصد میں دونوں ہم مسلک تھے، دونوں میں قریبی مخلصانہ تعلقات تھے۔ دونوں نے یکساں مذہبی ماحول کے خاندانوں میں آنکھیں کھولی تھیں، بدوِ شعور میں دونوں نے خاندانی ماحول سے بغاوت کی، دونوں نے زندگی کے کچھ ایام تشکیک والحاد کی حالت میں بسر کیے، پھر سعادتِ الٰہی نے دونوں کی راہنمائی کی، اور نہ صرف دونوں کا خاتمہ بالخیر ہوا، بلکہ دونوں کو ایک طویل عرصہ اسلام اور مسلمانوں اور قرآن حکیم کی خدمت کی توفیق نصیب ہوئی۔ ادب وانشا، صحافت وسیاست، مذہب وفلسفہ کا ذوق دونوں میں مشترک تھا۔ دونوں بزرگوں کی زندگی میں کیسی مماثلت تھی!

اس اشتراکِ ذوق وعمل کے باوجود خصائص میں پہچان دونوں کی الگ الگ تھی۔ دونوں کے مزاجوں میں بھی نمایاں فرق تھا، کئی مذہبی اور سیاسی مسائل میں دونوں کا اندازِ فکر مختلف اور پسند جداگانہ تھی، مولانا آزاد اپنا ایک مستقل نظامِ فکر رکھتے تھے، جب کہ مولانا دریا بادی سیاست میں مولانا محمد علی اور مذہب میں مولانا اشرف علی تھانوی کے نظامِ فکر سے تعلق رکھتے تھے، مولانا آزاد سے مولانا محمد علی معاصرانہ چشمک رکھتے تھے، اور حضرت تھانوی سے مولانا آزاد کا اس درجہ تجاہل کہ ہزاروں صفحوں میں پھیلے ہوئے رسائل وکتب سے اگر حکیم الامت کے وجود کا ثبوت ڈھونڈھا جائے تو نہ ملے۔ دونوں بزرگ دو الگ دنیاؤں کے باسی تھے۔

اس پس منظر میں دونوں معاصرین میں لگاؤ کے بجائے لاگ کا تعلق اور ربط و

اخلاص کی جگہ چشمک ہوتی تو تعجب نہ تھا، لیکن مولانا دریابادی معترف ہیں کہ مولانا آزاد کی جانب سے کبھی تنگ دلی کا اظہار نہیں ہوا، مولانا دریابادی کے کسی عزیزو معتقد کا شکوہ بھی سننے میں یا پڑھنے میں نہیں آیا۔

مولانا آزاد نے مولانا دریابادی کی قابلیت کا اعتراف کیا ہے۔ وہ ان کے اخلاص و محبت کے بھی قائل تھے۔ مولانا دریابادی نے مولانا آزاد کی زندگی میں بھی ان کے کمالات کا اعتراف کیا اور ان کے انتقال کے بعد بھی، اور کیفیت و کمیت، ہر دو لحاظ سے انھوں نے دوست کے ماتم کا حق ادا کر دیا۔ دوست کے ذہن و فکر کے کمالات، ملک و وطن کے لیے ان کے ایثار، دین و ملت کی خدمات، علوم و فنون میں ان کے نظر و عبور، ادب و انشا میں ان کے خصائص اور اخلاق و سیرت میں ان کے فضائل کا ذکر اور اعتراف انھوں نے شان دار الفاظ میں کیا ہے۔

بلاشبہ! اعترافِ کمال اور تحسینِ فضائل میں ان کا انداز ایک معتقد اور نیاز مند کا نہیں ہے، لیکن ایسا تو ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ مولانا آزاد سے عمر میں زیادہ چھوٹے نہ تھے۔ پیدائش میں چار سال کا فرق نوجوانی اور جوانی میں پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے، تلمذ و ارادت کا رشتہ نہ تھا، وہ اِس عہد کی انھی جیسی ایک شخصیت تھے۔

(۲)

مولانا دریابادی کو مولانا آزاد سے صحیح یا غلط کوئی شکوہ تھا، تو یہ دوستوں کا معاملہ تھا اور فکر و نظر میں کوئی اختلاف تھا یا وہ مولانا آزاد کی کسی تحقیق یا رائے سے متفق نہ تھے، تو انھیں اس بات کا حق پہنچتا تھا۔ اگر انھیں مولانا آزاد سے کوئی ذاتی اختلاف یا شکوہ تھا تو انھوں نے کبھی اس کا اظہار نہیں کیا۔ پس جس چیز کا وجود ہی نہ ہو یا جس بات کا انھوں نے اظہار نہ کیا ہو، اس کا ذمہ دار انھیں کیوں کر قرار دیا جا سکتا ہے؟ اگر انھوں نے کسی اور کے حوالے سے لکھا ہے کہ فلاں کو ان سے متعدد شکایات تھیں یا "وہ" ان کے کسی کام کے بالکل قائل نہ تھے اور "وہ" ان کے اخلاق کے بھی شاکی اور کمالات کے بھی منکر تھے، تو اس کے شکوے اور انکار سے مولانا دریابادی کا کیا تعلق؟

مولانا دریابادی کسی اور کا بوجھ کیوں اٹھائیں ؟

اس مسئلے پر اس طرح بھی نظر ڈالیے کہ ہمارے ممدوح اوّل مولانا ابوالکلام آزاد ہیں اور ہم ان کے ساتھ ہر جنگ میں فریق ! لیکن کیا مولانا آزاد نے کبھی مولانا دریابادی کو فریقِ جنگ ڈیکلیر کیا یا وہ کبھی ان کے متعلق کوئی حرفِ شکایت زبان پر لائے ؟ اگر ایسا نہیں تو ہمیں اس مقدمے میں وکالت نامہ داخل کرنے کی کیا ضرورت ؟

مولانا دریابادی اگر صرف ایک جملہ لکھ دیتے کہ مولانا آزاد کے بعض عقیدت مند اُن کے بارے میں جو گمان کرتے ہیں، وہ درست نہیں، تو یہ کافی تھا، مولانا دریابادی نے تو اس سے آگے بڑھ کر پوری صفائی پیش کر دی ہے کہ اگر کوئی رنجش ۱۹۱۳ئہ میں پیدا ہوئی تھی تو وہ چند سال بعد ہی دور ہو گئی تھی۔ پھر زندگی بھر کوئی ایسی بات واقع نہیں ہوئی۔ انھوں نے اسی پر بس نہیں کیا، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر اپنے کمالِ اخلاق اور عظمتِ سیرت کا ثبوت دیا کہ اپنا معذرت نامہ چھاپ دیا کہ بالفرض ایسا کوئی معاملہ پیش آیا ہو تو اس کے لیے مولانا آزاد کی روح سے عفو کے طالب ہیں، اللہ تعالیٰ انھیں معاف فرمائے۔ یہ بات انھوں نے ایک سے زائد بار لکھی ہے۔ "صدق جدید" میں "معاصرین" میں اور اسی قسم کا مضمون "آپ بیتی" میں آیا ہے۔ اب کون سی بات رہ جاتی ہے، جس کے لیے انھیں الزام دیا جائے اور ہمیں یہ حق کہاں پہنچتا ہے کہ اس کے شکوے سے اپنی زبان کو آلودہ کریں، بدگمانی میں مبتلا ہوں اور گناہ گار بنیں۔ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لَھُمَا۔

مولانا دریابادی اسلامی اخلاق کا نمونہ تھے، وہ ایک وضع دار انسان تھے، ان میں سیرت کی بے شمار خوبیاں تھیں۔ وہ ہماری تاریخ علم و تہذیب کا سرمایہ تھے۔ یہ ہماری شرافت کا تقاضا اور سعادت کا ثبوت ہے کہ ان کو اچھے لفظوں میں یاد کریں اور ان کے محاسن کا تذکرہ کریں۔

(۳)

پیشِ نظر تالیف مولانا عبدالماجد دریابادی کی ان تحریروں کا مجموعہ ہے، جو انھوں نے "صدق جدید" میں یا اپنی کسی تصنیف میں مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق لکھی تھیں۔ جو تحریریں

جہاں سے لی گئی ہے، اس کا حوالہ درج کر دیا ہے۔ "صدق جدید" کے حوالوں میں صرف تاریخ اشاعت کا حوالہ کافی سمجھا گیا۔

مراسلات، شذرات (دسچی باتیں)، انھی عنوانات کے تحت درج ہیں۔ تبصروں اور خطوط کے لیے کسی نئے عنوان کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ بعض مراسلے اور شذرے کسی خاص عنوان کے تحت درج ہوئے ہیں۔ اس میں مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام مولانا آزادؔ کے خطوط بھی شامل کر لیے ہیں۔ یہ خطوط اگرچہ کئی رسائل میں چھپ چکے ہیں اور "تبرکات آزاد" میں بھی شامل ہیں۔ لیکن مجموعے کی جامعیت کا تقاضا تھا کہ انھیں اس میں ضرور شامل کر لیا جائے، چند خطوط مولانا آزادؔ کے نام مولانا دریابادی کے بھی تھے جو ایک کتاب میں شامل تھے، لیکن بہت کم اصحاب ذوق کو ان کی اشاعت کا پتا تھا، انھیں بھی اس مجموعے کا حصہ بنا لیا گیا ہے۔

(۴)

میری نظر سے ابھی کوئی ایسا جامع مضمون نہیں گزرا، جس میں ادب، صحافت، مذہب، سیاست میں حضرت مولانا آزادؔ کے افکار و خدمات کے تجزیے کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا ہو کہ اصلاً ان کا میدان کیا تھا؟ مختلف اہل قلم نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق مولانا کی شخصیت کی بنیادی حیثیت کا بھی فیصلہ کر دیا ہے، یا ان سے اپنی عقیدت کے مطابق انھیں ہر لحاظ سے، ہر دائرے میں عظیم بلکہ اعظم قرار دے دیا ہے۔ بلاشبہ وہ ہر دائرے میں بڑے تھے، اور ہر حیثیت میں اپنا نمایاں مقام رکھتے تھے، لیکن یہ سوال ابھی باقی ہے کہ ان کی بنیادی شخصیت کیا تھی؟ شاید اس سوال کے جواب میں ابھی وقت لگے گا۔
بہ ہر حال اگر کبھی یہ فیصلہ کیا جائے تو حضرت مولانا دریابادی کی یہ رائے ضرور پیش نظر رہنی چاہیے کہ مولانا کا خاص میدان ادب ہے، اس لیے ان کے فکر و فن کے خصائص اسی میدان میں، ان کے اسلوب و انشا میں تلاش کرنے چاہییں۔ وہ اردو کے ادیبِ اعظم ہیں۔

ابو سلمان شاہجہان پوری، ۲۷-۱-۱۹۸۶ء

اُردُو کا اَدِیبِ اعظم

ایک دو لفظی تعارف[1]

ابوالکلام کی ذات جامع صفات، جامع جہات، جامع حیثیات ہے۔ ان سب میں بالاترین حیثیت ان کے ادیب و انشا پرداز ہونے کی ہے۔ ان کی سیاسیات میں قیل وقال کی گنجایش ہے۔ ان کے علوم دین کے باب میں گفتگو چل سکتی ہے اور چل چکی ہے۔ لیکن کم ہی ایسا ہوا ہے کہ ان کی ادبی عظمت تسلیم نہ کی گئی ہو۔

ادب عالی میں ان کا مقام ممتاز ومخصوص ہے اور اگر ان کی انشاء کا ترجمہ دوسری زبانوں میں آسانی سے ممکن ہوتا تو مولانا کو بے تکلف دوسری زبانوں کے اعلیٰ انشا پردازوں کی صف میں کھڑا کیا جا سکتا تھا اور اس سے اردو والوں کی آنکھیں ہرگز نیچی نہ ہوتیں۔ ان کا طرزِ انشاء ۲۵-۲۰ سال سے وہ نہیں رہا ہے جو آج سے ۴۰-۴۵ سال قبل الہلال والبلاغ کے دور میں تھا وہ طرز قدیم بدر کامل بن کر تذکرہ کے افق پر چمکا۔ وہ اغلاق مدت ہوئی رخصت ہو چکا ہے۔ وہ دشوار پسندیاں اب افسانۂ ماضی ہیں اور اب ان کی جگہ ایک آسان و عام فہم اسلوبِ بیان نے لے لی ہے۔ تاہم گہری معنویت، شکوہ و عظمت جس طرح قدیم طرز کے خصوصیات میں داخل تھیں اب بھی جانِ تحریر ہیں اور شگفتگی اور دلآویزی تو کہنا چاہیے کہ ابوالکلام کے قلم کا حصہ ہیں۔

---

[1] آغا شورش کاشمیری مرحوم نے حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی میں چٹان کا حضرت مولانا سے منسوب ایک خاص نمبر نکالنے کا عزم کیا تھا۔ اسی سلسلے میں مولانا عبدالماجد دریابادی سے مضمون لکھنے کی فرمائش کی تھی اور انھوں نے ازراہِ عنایت ۲۴ر نومبر ۱۹۵۶ء کو مضمون لکھ بھی دیا تھا۔ لیکن حضرت مولانا آزادؒ نے شورش مرحوم کو ان کی زندگی میں کوئی نمبر نکالنے سے منع کر دیا اور فرمایا کہ جو کچھ کرنا ہے، میرے مرنے کے بعد کریں۔ اس لیے مضمون اس وقت نہ چھپ سکا۔ حضرت مولانا آزاد کے انتقال کے بعد ۱۵ر فروری ۱۹۶۵ء کو "ابوالکلام نمبر" میں شائع ہوا۔

ابوالکلام نے اگر اپنے قلم سے ادب اردو کی چمن کی آبیاری نہ کی ہوتی تو تاریخ ادب اردو کے ایک مستقل باب کے اوراق یقیناً سادہ رہ جاتے ـــــ اسلوب کی بلندی اور لہجہ کی شگفتگی کے ساتھ ساتھ لفظ وعبارت کی صحت اور ترکیب و بندش کی چستی کا التزام اگر دیکھنا ہو تو ابوالکلام کی تحریریں مثال انشاپردازی کا کام دیں گی۔ شوخ نگاری کے دائرے ابتذال سے ملے ہوئے ہیں، ذرا چوک ہوئی اور شوخی بازاریت میں تبدیل ہوگئی۔ یہ کمال ابوالکلام کا ہے کہ ورق کے ورق ان کی شوخ نگاریوں کے اُلٹتے جائیے اور کہیں شائبۂ ابتذال بھی نظر نہ آئے گا۔ اسی طرح بسط وتفصیل کے وہ بادشاہ ہیں اس پر بھی اکتا دینے والی طوالت کا نام ونشان بھی ان کے ہاں نہ ملے گا۔

وہ اپنے طرز انشاء کے جس طرح موجد ہیں اسی طرح اس کے خاتم بھی ہیں، تقلید کی کوشش بہتوں نے کی پیروانِ غالب کی طرح تقریباً سب ہی ناکام رہے۔ لے دے کے صرف دو اہلِ قلم کامیاب کہے جا سکتے ہیں اور نفاق سے وہ دونوں پاکستانی شہر لاہور ہی کے ہیں[۱]۔ لیکن ان دونوں کی کامیابی بھی ۵۰ فیصدی سے زیادہ نہیں۔ ایک نے بندشوں کی چستی، ترکیبوں کی استواری، الفاظ کا شکوہ، عبارت کی متانت اور جاندار فارسی اشعار کے انتخاب میں استاد کا رنگ پوری طرح اڑا لیا۔ لیکن شوخی وظرافت کا صفحہ کورے کا کورا رہ گیا۔ دوسرے نے شوخ نگاری اور استعارہ پردازی میں چربہ بر آثار نے کا کمال دکھا دیا لیکن متانت وجزالتِ تحریر کا بارِ گراں ان کا قلم نہ سنبھال سکا۔ غرض یہ کہ بہ حیثیتِ مجموعی ابوالکلام اپنی انشاپردازی میں اب تک بالکل منفرد و یکتا ہیں اور بہ ظاہر احوال نظر یہی آتا ہے کہ غالب کی طرح ان کی بھی یکتائی وقتی نہیں، مستقل ہے۔ حال ہی کے لیے نہیں مستقبل کے لیے بھی ہے۔

عبدالماجد

---

[۱] پاکستان کے ان دو اہلِ قلم سے مراد مولانا غلام رسول مہر اور آغا شورش کاشمیری ہیں۔

ابوالکلام آزاد

چند یادیں

۱۹۰۵ء کا آخری زمانہ تھا۔ جب یہ نام اوّل اوّل نظر سے گزرا۔ الندوہ مرحوم کے ایک محترم مضمون نگار کی حیثیت سے۔ میں ہائی اسکول کا طالب علم تھا۔ غالباً نویں درجہ کا۔ اور مرحوم اس وقت بھی تحریر میں ایک امتیازی مقام حاصل کر چکے تھے۔ سن میں مجھ سے کل ۳، ۴ سال بڑے تھے۔ الندوہ، مولانا شبلی نعمانی کی ادارت میں وقت کا ممتاز ترین ماہنامہ علمی اعتبار سے تھا۔ اس کی مضمون نگاری بجائے خود ایک اعلیٰ سند تھی۔ اس کے ہوتے ہوئے کسی مزید شہادت کی ضرورت ہی نہ تھی —— مولانا اس وقت تک "مولانا" نہ تھے۔ محض ابوالکلام آزاد تھے۔ ماہنامہ خدنگِ نظر (لکھنؤ) میں ایک آدھ مضمون لکھ چکے تھے۔ اور شاید اپنا ہفتہ وار لسان الصدق (کلکتہ) بھی کچھ دن تک نکال چکے تھے۔ بہرحال الندوہ میں موضوع تحریر فرید وجدی مصری کی کتاب المرأۃ المسلمہ تھی۔ جسے مولانا نے عربی سے اُردو میں اپنایا تھا اور اس میں جدید طبقہ کے جواب میں، طبی، شرعی ہر قسم کے دلائل سے یہ دکھایا تھا کہ عورت مرد کے برابر نہیں۔ اور دونوں کی مساوات کا دعویٰ تمام تر غلط ہے۔ مضمون نگار کی طرف سے دل و دماغ میں عظمت پیدا کرنے کے لیے بس اسی قدر کافی تھا —— ایک آدھ پرچہ میں بلند پایہ مصری رسالوں سے ماخوذ "علمی خبریں" بھی اسی قلم سے۔ زورِ قلم اور جوشِ تحریر سے اس سن میں اندازہ یہ ہوا کہ شخصیت بھی بڑی ہی تزوردار ہوگی۔ اور صورت کا نقشہ ذہن کے سامنے یہ جما کہ بڑے کلے ٹھلے کے ہوں گے۔ آواز سب پر غالب رہتی ہوگی۔ کسی کو اپنے سامنے بولنے نہ دیتے ہوں گے۔

۱۹۰۷ء تھا کہ دارالعلوم ندوہ (لکھنؤ) میں دستار بندی کا جلسہ بڑی دھوم سے ہوا۔ اور مولانا شبلیؒ کے نام کی کشش اس طالب علم کو بھی وہاں گھسیٹ لائی تھی۔ رفاہِ عام کلب کے وسیع ہال (کہ لکھنؤ میں عام جلسہ گاہ اس وقت وہی تھی۔ امین آباد پارک کے وجود میں آنے سے قبل) میں ملک بھر کے اہلِ علم کھنچ کر آگئے تھے۔ سید سلیمان بہاری کو جو آگے چل کر علامہ سید سلیمان ندوی ہوئے۔ سندِ فضیلت اسی جلسہ میں ملی تھی۔ اور اسی میں انھوں نے فصیح عربی میں، برجستہ اور مفصّل تقریر سے سارے حاضرین کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔ اتفاق سے شروع ہی میں ان کی زبان سے کہیں نکل گیا تھا، کہ شرطِ نجات توحید ہے۔ اس پر ان کے اُستاد مولانا شبلی نے ٹوکا کہ توحید و رسالت کہو۔ معاً ایک اور صاحب جو پہلے سے ہی بہت پیش پیش تھے۔ بول اٹھے کہ "نہیں" کہنے دیجیے وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ من قال لا الٰہ الا اللہ فدخل الجنۃ کی سند موجود ہے" ـــــ دل حیران کہ یا الٰہی یہ کون صاحب اتنے دبنگ نکلے کہ مولانا شبلی کو بھی لقمہ دے بیٹھے ہو نہ ہو ابوالکلام آزاد ہی ہوں گے۔ ان کے سوا اور کون یہ ہمت کر سکتا ہے! ان کا قیافہ، ان کا کینڈا کہے دیتا ہے، کہ یہی ابوالکلام ہیں! بعد کو پتہ چلا کہ یہ قیاس تمام تر غلط اور استنباط یکسر مہمل تھا وہ ٹوکنے والے صاحب موائمہ ضلع الٰہ آباد کے شیخ عبدالرؤف تھے جو اپنے زمانہ کے ایک مقبول اہلِ قلم ہوئے ہیں۔ سرسید کے عقائد سے متاثر۔

دو ڈھائی سال اور گزرے۔ میں لکھنؤ میں کالج کا طالب علم تھا، کہ سردی کے موسم میں ایک روز دوپہر کے وقت دو چار ساتھیوں سمیت کسی ضرورت سے اسٹیشن جانا ہوا پلیٹ فارم پر دیکھا کہ سکنڈ کلاس ویٹنگ روم سے ایک نوجوان سگرٹ پیتے برآمد ہوئے، گورے، چٹے، خوش رو، جامہ زیب، کشیدہ قامت، چھریرے بدن کے، سیاہ شیروانی اور سیاہ ایرانی ٹوپی میں ملبوس۔ جوانِ رعنا ایسے کہ نظر ان پر خواہ مخواہ پڑے۔ پوچھ گچھ شروع ہوئی، کسی نے کہا کہ کوئی ایرانی پرنس (شہزادہ) معلوم ہوتا ہے۔ آخر کو کھلا کہ یہی ابوالکلام آزاد ہیں! ـــــ یہ زمانہ کوئی اخیر ۱۹۰۹ء کا ہوگا۔ مولانا عرصہ ہوا الندوہ سے سبکدوش ہو کر لکھنؤ چھوڑ چکے تھے۔ کچھ دنوں امرتسر کے معروف و معزز

سہ روزہ وکیل میں رہے تھے۔ اور اور بھی رسالوں میں ان کا نام آنے لگا تھا ـــــ اصل صورت، خیالی صورت سے بہت مختلف نکلی، اور کہیں زیادہ حسین و جاذبِ نظر۔

ملاقات اور ذاتی حصولِ نیاز کی نوبت اس کے بھی بعد آئی۔ سنہ غالباً ۱۹۱۰ء تھا۔ اور، آزاد، اس وقت مولانا شبلی کے ہاں مہمان آئے ہوئے تھے۔ مولانا اس وقت محلہ احاطہ فقیر محمد خاں کی ایک گلی کے اندر ایک مکان میں رہتے تھے۔ اور ان کا نام اُن کی زبان پر صرف "آزاد" تھا۔ نہ مولوی، نہ مولانا نہ محی الدین، نہ ابو الکلام، بلکہ صرف آزاد زبان پر بھی یہی اور خطوط میں قلم پر بھی یہی ـــــ غیر معمولی ذہانت، خطابت، طراری، طلاقت لسانی کے قصے اسی زمانہ سے سننے میں آنے لگے۔ لیکن مولانا شبلی کے ساتھ میں نے انہیں ہمیشہ با ادب ہی پایا، تنہائی کی صحبتوں میں ممکن ہے کہ بے تکلفی زیادہ برتتے ہوں لیکن بہر حال اپنی شہادت تو اپنی آنکھوں دیکھی ہوئی چیزوں تک محدود رہے گی۔

اسی کے بعد غالباً ۱۹۱۲ء میں الہلال افق کلکتہ سے طلوع ہوا۔ اور اب مولانا کا قیام کلکتہ میں مستقل ہو چکا تھا۔ اس نے اُردو صحافت کی جیسے دنیا ہی بدل دی۔ صورت و سیرت، مغز و قالب سب ہی اپنے پیش رو اور معاصر ہفتہ داروں سے بالکل مختلف، اور کہیں زیادہ شاندار اور جاندار۔ چھپائی، کاغذ، تصویریں، سب کا معیار اعلیٰ۔ رنگین سرورق پر ایڈیٹر کا نام یوں درج ہوتا "احمد المکنیٰ بابی الکلام الدہلوی۔ یہ "المکنیٰ" کے صحیح تلفظ اور معنی کے لیے صراح و قاموس کی ورق گردانی کرنی پڑی اور "اڈیٹر" کہاں! اس کی جگہ "مدیرِ مسئول" "محررِ خصوصی اور رئیسِ قلم تحریر"۔ جریدہ کی جگہ "مجلّہ" ولایتی ڈاک کی جگہ "بریدِ فرنگ" "حیرت انگیز کی جگہ "محیر العقول"، قسم کے خدا جانے کتنے نئے اور بھاری بھر کم لغات اور نئی ترکیبیں نئی تشبیہیں، نئے استعارے اور نئے اسلوب بیان، ہر ہفتہ اس ادبی و علمی ٹکسال سے ڈھل ڈھل کر باہر نکلنے لگے اور جاذبیت کا یہ عالم تھا کہ نکلتے ہی سکۂ رائج الوقت بن گئے! ـــــ حالی و شبلی کی سلاست

وساد گی سرپیٹتی رہی، اور اکبر الٰہ آبادی اور عبدالحق موجودہ بابائے اردو بس ہائیں ہائیں کرتے رہ گئے!

الہلال نکلتے ہی ابوالکلام مسلّم طور پر 'مولانا' ہو گئے، اور شہرت کے پروں سے اُڑنے لگے۔ الہلال کی مانگ گھر گھر ہونے لگی۔ اور مولانا کی خطابت کے جوہر بھی اسی وقت سے خوب چمکے ہر جلسہ کی رونق ان کی ذات سے ہونے لگی۔ الہلال بہ ظاہر ایک سیاسی پرچہ تھا لیکن اس کی دعوت تمام تر دینی رنگ میں تھی۔ اور اس کی سیاست پر بین الملّی اسلامیت کی چھاپ لگی ہوئی۔ بات بات پر آیات قرآنی سے استدلال واستناد۔ علمی ادبی پہلو بھی نمایاں تھے اور فکاہی رنگ بھی کچھ کم شوخ نہ تھا۔ اچھے اچھوں کی قلعی اس کے کالموں میں کھل جاتی۔ اور بڑے بڑے اس سے ٹکر لیتے۔ دبتے، ہچکچاتے تھے۔ مولانا کی بے پناہ ذہانت، فطانت، حاضر جوابی، برجستہ گوئی، بذلہ سنجی کا نمایاں ترین دور یہی رہا ہے۔ لکھنؤ آتے جاتے رہتے۔ قیام شروع میں مولانا شبلی کے ہاں رہتا (جواب خود نئے بنے ہوئے امین آباد پارک کے ایک بالاخانہ پر اٹھ آئے تھے۔ اور الفاروق وسیرۃ النعمان سے کہیں زیادہ اب شعر العجم کے مصنف نظر آنے لگے تھے۔ اور مولوی سے بڑھ کر غزل گو شاعر اور نقاد کی حیثیت اختیار کیے ہوئے تھے) پھر جب مولانا لکھنؤ سے منتقل ہو کر اپنے وطن اعظم گڑھ چلے گئے، تو بھوپال ہاؤس (جس کا اب وجود بھی باقی نہیں) لال باغ میں نواب صفی الدولہ حسام الملک علی حسن خاں بھوپالی کے ہاں بھی ایک آدھ بار ٹھہرے۔ اور اس کے بعد اپنے لیے مستقل مہمان خانہ حسین گنج کے سول اینڈ ملٹری ہوٹل (موجودہ برلنگٹن ہوٹل) کو بنا لیا تھا ——— الہلال کی دعوت سے اُس وقت کے اس ملحد نیاز مند کو اتفاق کیونکر ہو سکتا تھا۔ چہ جائیکہ جب کوئی علمی رعب بھی دماغ پر مولانا شبلی کی طرح اُن کا نہ تھا۔ اور دل میں ان کی وقعت بجائے کسی عالم و فاضل کے محض ایک لسان اور پُرجوش خطیب کی تھی۔ ادھر مولانا شبلی نے یہ کیا کہ میرا ایک آدھ مضمون (انگریزی سے ترجمہ) جو الندوہ کے لیے لکھا گیا تھا۔ الہلال کی طرف منتقل کر دیا۔ اس کی تاب میں نہ لا سکا۔ اور طبیعت جو

اس نوعمری کے جوش میں۔ بحث و جدل کے لیے بہانہ ڈھونڈھ رہی تھی۔ کچھ ہی روز بعد بعض اصطلاحات علمی کی آڑ میں صاحب الہلال سے الجھ ہی پڑی۔ دو چار مضمون خوب گرما گرم نکلے۔ وہ تو خدا بھلا کرے ایک فاضل ندوی دوست کا۔ جنہوں نے درمیان میں پڑ کر یہ سلسلہ رکوا دیا۔ ورنہ نوبت خدا جانے کہاں تک جا پہنچتی۔

یہ سب کچھ تو اخباری صفحات پر ہوتا رہا۔ لیکن مولانا کا ظرف اور جوہر شرافت جو آگے چل کر بہت نمایاں ہوا۔ اس وقت بھی بہر حال اتنا موجود تھا کہ اس نے کوئی اثر نجی کے تعلقات پر نہ پڑنے دیا۔ آپس کی خط و کتابت اسی طرح جاری رہی، جیسے پہلے تھی۔ اور مولانا جوابات پابندی کے ساتھ اور دوستی، شفقت و محبت کے لہجہ میں بدستور دیتے رہے۔ لکھنؤ اب جب آئے تو نان و نمک کے لیے ایک آدھ بار غریب خانہ کو بھی سرفراز کیا۔ اور جب اس کا موقع نہ نکل سکا، تو میں نے خود ہی ماحضر مولانا کے ہوٹل پہنچا دیا، میں اس وقت تک دریابادی نہیں، لکھنوی ہی تھا —— اسی زمانہ میں۔ اور اب یہ ذکر جون ۱۹۱۳ء کا ہے۔ ایم، اے کا امتحان دے چکنے کے بعد میرا جانا کلکتہ کا ہوا۔ تو مولانا نے اصرار کر کے اپنی ہاں میکلوڈ روڈ پر ٹھہرایا۔ اور خوب خاطرین کر کے مہمان نوازی کا حق پوری طرح ادا کر دیا۔ ضمناً و تبعاً سہی۔ لیکن بہر حال یہ بات بھی اس منزل پر سُن لینے کے قابل ہے، کہ یہ وہ وقت تھا جب الہلال کے اسٹاف میں بہترین اشخاص کا مجمع تھا۔ تین نام یاد رہ گئے۔ حامد علی صدیقی۔ مولانا عبد اللہ عمادی۔ اور سب سے بڑھ کر مولانا سید سلیمان ندوی —— روزنامہ کے لیے نہیں۔ ایک ہفتہ وار کے لیے اتنا بڑا اور ایسا کھرا اسٹاف اُردو صحافت کی تاریخ میں کسی اور کو کیوں نصیب ہوا ہوگا!

جن لوگوں نے مولانا کو برائے سنجیدگی و وقار ان کی زندگی کے آخری ۲۵، ۳۰ سال میں دیکھا ہے۔ وہ اندازہ ہی نہیں کر سکتے کہ وہ ۱۳ء ۱۴ء میں کیا تھے۔ (اور اس سے بھی قبل یعنی اپنی بھرپور جوانی نہیں، بلکہ آغاز جوانی کے سن میں وہ کیا تھے۔ اسے تو سرے سے چھوڑیے) ذہانت و فطانت کا مجسمہ، شوخی و بذلہ سنجی کا مرقع، حاضر جوابی میں طاق،

لطیفہ گوئی میں استاد۔ اِسے چھیڑا، اُسے بنایا، اس پر فقرہ چست کیا، اُسے چٹکیوں میں اڑایا۔ لوگ تنہا ملتے جلتے، سامنا کرتے، گھبراتے، ہچکچاتے اور کنی کاٹ جاتے۔ ۱۳ء کا آخر تھا یا ۱۴ء کا شروع۔ لکھنؤ میں کھانے پر بلانے کو تو بلا دیا۔ لیکن فکر یہ ہوئی کہ اتنی دیر مسلسل ہدف ان حضرت کے گرما گرم فقروں کا کون بنا رہے گا؟ —— اپنے جوار میں ایک بڑے طرار، شوخ گفتار، طلق اللسان، خوش بیان، ادیب، ظریف، چودھری محمد علی رودولوی تھے (تھے، بہ قید ماضی نہیں، ماشاء اللہ اس وقت بھی ہیں) بس انھیں گھیر گھار کر لے آیا گیا۔ اور ہم تماشائیوں کو لطف مہذب و شستہ لطیفہ گوئی، بذلہ سنجی اور برابر کی نوک جھونک کا آتا رہا —— چودھری صاحب نے کہیں اپنے حلقۂ ظرافت کی اصطلاح "بور" Bore چالو کی، مولانا نے فرمایا کہ آپ کی تعریف؟ چودھری صاحب بولے۔ بور مردے ست کم عقل کہ بے ارادہ دیگران را مکلّف باشد۔ مولانا نے داد دی کہ سبحان اللہ! تعریف کے لیے زبان بھی آپ نے خاص غیاث اللغات کی استعمال فرمائی!

باضابطہ تعلیم اور اصطلاحی تدریس تو مولانا کی بھی بعض اور مشاہیر ماضی و حال کی طرح، کچھ ایسی زیادہ نہ تھی۔ لیکن خدا معلوم کتنے مختلف علوم اور متعدد فنون کے خزانے دماغ میں جمع ہو گئے تھے۔ اور ہر وقت مستحضر، طب ہو کہ الٰہیات، فقہ ہو یا کلام، شعر و ادب ہو یا موسیقی، تاریخ ہو کہ سیاسیات۔ جس فن سے متعلق جو بھی موضوع ہو، بس گفتگو چھڑنے کی دیر تھی، یہ معلوم ہوتا تھا کہ سامنے کوئی معمولی واقف کار ہی نہیں، ماہر فن تقریر کر رہا ہے۔ اور تقریر بھی ایسی دلآویز مربوط کہ فصاحت و بلاغت بلائیں لیتی جا رہی ہے۔ غضب کا حافظہ تھا، اور غضب کی خوش دماغی —— اور زبانوں پر عبور تو اور بھی حیرت انگیز تھا۔ اپریل ۱۹۱۲ء میں جب سید رشید رضا مصری (المنار والے) لکھنؤ جلسۂ ندوہ کی صدارت کو تشریف لائے۔ تو ان آنکھوں نے دیکھا کہ ان سے برجستہ اور بے تکلف عربی میں گفتگو کرنے والوں میں سب سے پیش پیش ابوالکلام ہی تھے —— فارسی شعر میں ان کا تبحّر دیکھ کر گمان یہ گزرتا تھا، کہ اساتذۂ فارسی کے دیوان اس شخص نے نوک زبان کر لیے ہیں! —— اور

اُردو کے لیے تو کچھ کہنا ہی تحصیلِ حاصل ہے۔ زبان مادری سہی، پھر بھی اس کے ہر گوشہ اور ہر پہلو پر اتنی وسیع اور جامع نظر رکھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ بڑے بڑے اس جامعیت کے معیار پر "فیل" ہی ثابت ہوتے ہیں۔ مستثنیٰ کسی حد تک بھی اگر کسی کی ذات رکھی جا سکتی ہے، تو وہ ابوالکلام کی۔ اور یہ اُردو کے تاریخ نگاروں کی محض کم بینی ہے کہ انھوں نے اپنی تاریخوں کو مولانا کے ذکر سے خالی رکھ چھوڑا ہے۔ تاریخ اُردو میں ان کے نام کا ایک مستقل باب ہی نہیں۔ بلکہ بہ حیثیت صاحب طرز انشاء پرداز کے ان کے نام کا باب، بابِ عالی شان بھی ہونا چاہیے۔ اُردو کو انھوں نے ایک مستقل اور بالکل نیا اسلوبِ بیان عطا کیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کوئی اور اس اسلوب کا نباہنا اپنے بس ہی میں نہ پائے۔

لکھنؤ کی زبان میں ایک نازک اور باریک سی چیز "پہلوئے ذم" ہے۔ باہر والے تو اسے کیا سمجھیں گے۔ خود لکھنؤ ہی کے اچھے اچھے استاد یہاں آکر غچا کھا گئے ہیں۔ حسرت موہانی سے بڑھ کر زبان کے نکتوں پر نظر کس کی ہوگی۔ لیکن اس میدان میں آکر لغزش کچھ نہ کچھ ان کے قدم کو بھی ہو گئی۔ جلال لکھنوی استاد کیا معنی استادوں کے استاد ہوئے ہیں۔ بار لوگوں نے اس کوچہ میں آکر اُن کی بھی زبان پکڑی ہے۔ مولانا کا قیام لکھنؤ میں کچھ زیادہ طویل نہیں رہا۔ یہی دو ڈھائی سال رہا ہوگا۔ اور اس درمیان میں راہ و رسم لکھنؤ کے اہلِ زبان طبقہ میں سے۔ بجز ایک مرزا محمد ہادی (ناول میں "رسوا" اور شعر میں مرزا) کے شاید ہی کسی سے رہی ہو۔ اس کے باوجود پہلوئے ذم کی باریکیوں میں نظر بال کی کھال پہ رکھنے لگے تھے۔ اور لکھنویوں سے بڑھ کر لکھنوی ہو گئے تھے —— کسی کا مصرع ہے۔

یاد آئے ہمیں اپنے ایام

مولانا کو ایک بار الہلال میں اس کے لانے کی ضرورت پیش آگئی۔ تو بعینہ نہیں بلکہ تصرف کر کے یوں لکھا،

یاد ہیں ہم کو تمہارے ایام

پہلوئے ذم سے بچنے کا اتنا اہتمام ہر پیدایشی لکھنوی کو بھی نصیب نہیں۔

۱۸ء تھا۔ اور مولانا رانچی جیل میں نظر بند تھے، خیال آیا۔ اور احساس پیدا ہوا کہ الہلال کے زمانہ سے جو شکر رنجی سی مولانا سے چلی آرہی ہے۔ اسے بالکل دُور ہو جانا چاہیے۔ معذرت کا خط ڈرتے ڈرتے لکھا۔ کہ دیکھیے جواب کیا آتا ہے۔ جواب جو آیا محض ضابطہ کا نہیں۔ شرافت اور عالی ظرفی کے کمال کا مظہر تھا۔ (انشاء اللہ کبھی فرصت سے ایسے خطوط تلاش کر کے شائع بھی کر دیے جائیں گے ــــ الہلال کی بندش خود مولانا کی اسیری اور نظر بندی اور البلاغ کی چند روزہ اشاعت کے بعد سے مولانا دوسرے تھے۔ اب ان کا شمار ملک کے صفِ اوّل کے لیڈروں میں تھا۔ اور دعوت کا رُخ بھی اسلامی ملّت سے ہندوستانی قومیت کی طرف پھر گیا تھا۔ اب رفتہ رفتہ وہ کانگریس کے بڑوں میں تھے۔ اور ان کی مانگ ہر بڑے سیاسی جلسے میں ہونے لگی۔ لیڈروں میں اب وہ اتنا گھر گئے تھے، کہ ہم قدیم، بے تکلف نیاز مندوں کی رسائی بھی اُن تک مشکل تھی پھر بھی کسی درجہ میں وہ اپنی وضعداری کو نبھائے گئے ــــ ۲۵ء تھا کہ خلافت کمیٹی کے رشتہ سے تعلقات کی تجدید از سر نو ہوئی۔ اور ملاقاتیں جلد جلد ہونے لگیں۔ اب مولانا صدرِ خلافت تھے، اور یہ نیاز مند بھی ایک چھوٹا موٹا سا صدر اپنے صوبہ کی خلافت کمیٹی کا۔ سالانہ جلسوں کے علاوہ مرکزی خلافت کمیٹی اور پھر مجلسِ عاملۂ خلافت کے جلسہ بار بار ہوتے اور کانپور و لکھنؤ کے علاوہ دہلی میں بھی بارہا نیاز کے موقع ملے۔

اواخر ۲۸ء میں "نہرو رپورٹ" کی اشاعت کے بعد سے پھر تعلقات گھٹ گئے، اور ہم دونوں کی سیاسی راہیں الگ ہوتی چلی گئیں، پھر بھی مولانا نے تمام تر اس نیاز مند کو فراموش نہ کیا۔ اور آخری بار جیل سے نکلنے کے بعد جب غبارِ خاطر شائع کی۔ تو اس کا ایک نسخہ لطف فرمایا یہ بات شاید ۴۵ء کی ہے۔ ۴۷ء میں جب مولانا سرکارِ ہند میں وزارتِ تعلیم کے منصب پر فائز ہوئے تو بجائے خالص مبارکباد پیش کرنے کے اس گستاخ نے ڈھٹائی کے ساتھ خط کچھ اس قسم کا لکھ مارا کہ" اس سرکاری تقرر سے تو ہم نیاز مندانِ قدیم کو کچھ زیادہ خوشی نہیں۔ جی یہ چاہتا تھا کہ اس سرکاری تعلق سے جہاں ہر وقت سابقہ کاغذات پر دستخط کرنے اور فائلوں کی ورق گردانی سے رہے گا۔ آپ آزادہ کرم سرکارِ ہند

کے ایک غیر سرکاری مشیرِ اعلیٰ وزارتِ علوم و معارف رہتے "

"۴۸ء تھا کہ آل انڈیا ریڈیو مشورتی کمیٹی کے ممبر کی حیثیت سے دہلی جانا ہوا۔ مولانا اسی تپاک اور گرمجوشی سے ملے، کہ جیسے پہلے کسی زمانہ میں ملتے تھے۔ وزارتِ ہند کی اونچی کرسی کوئی فرق اس میں پیدا نہ کر سکی۔ دوپہر کے لنچ پر بلایا۔ اور اسی روز پشاور کے خان عبدالغنی (فرزند خان عبدالغفار) بھی مدعو تھے۔ ملاقاتوں اور گفتگوؤں میں وہی زور شور، وہی طلاقت لسانی، وہی جامعیت و ہمہ گیری۔ سننے والا حیران و ششدر۔ خوش خلقی، انسانی ہمدردی، مرنجان مرنج میں پہلے سے کہیں آگے بڑھے ہوئے تعلّی و ترفّع کے بجائے پیکر تواضع بنے ہوئے۔ شرافت نفس اور عالی ظرفی کا یہ عالم کہ اپنے مخالفین، خصوصاً مسلم لیگ کے لیے گلہ شکوہ کا شائبہ بھی زبان پر نہیں، سب کا ذکر یکساں خوش دلی سے۔ بلکہ پاکستان کے حق میں بجائے شکایت و شماتت طنز و تعریض کے۔ الٹا کلمۂ خیر! اور کچھ اس قسم کے الفاظ، کہ اب جبکہ وہ بن چکا ہے۔ ہم سب کی فلاح و بہبود اسی میں ہے کہ وہ طاقتور بنے! سیاسی لیڈروں میں اس ظرف کی مثال نادر ہی ملے گی۔

۵۰ء تھا کہ حکومتِ حیدر آباد نے میری سالہا سال کی پنشن بغیر کسی اظہارِ وجہ کے، دفعۃً بند کر دی۔ مولانا کو خبر ہوئی، تو سینہ سپر ہو گئے۔ حیدر آباد گورنمنٹ کو خط پر خط بھجوائے اور اتنی بار لکھا کہ بہ قول وہیں کے ایک بڑے عہدہ دار کے "گورنمنٹ آف انڈیا سے کسی کے لیے اتنی بار لکھ کر نہیں آیا" ——— کون جانتا تھا کہ ۵۱ء کی ملاقات اس پیکرِ شرافت و حلم سے اس عالم ناسوت میں آخری ملاقات ہوگی!

بشری لغزشوں اور کمزوریوں سے پاک ہونے کا دعویٰ کس کے متعلق کیا جا سکتا ہے۔ اللہ اُن کی خوبیوں اور بندگانِ خدا کے ساتھ اُن کے حسن سلوک کو ان کا شفیع بنائے۔ ان کی دینی خدمتوں کو خلعتِ قبول سے سرفراز کرے اور بال بال اُن کی مغفرت فرمائے۔

(صدق جدید۔ ۷، ۱۴ مارچ ۱۹۵۸ء)

"ابوالکلام کی شخصیت"

(لکھنؤ ریڈیو سے نشریہ ۱۱ر نومبر کو وقت ۱۰ منٹ)

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

کوئی اور مومن - اس آن، اس شان، اس سج دھج، اس خو بو کا ہو یا نہ ہو - ان آنکھوں نے ایک تصویر تو اقبال کے قلم حقیقت رقم کی کھینچی ہوئی اپنے زمانے میں دیکھ ہی لی - اور تصویر بھی کیسی! سجی سجائی، نک سک سے درست، نوک پلک سے آراستہ، نج کی محفلیں ہوں یا یاران بے تکلف کا مجمع، تو آپ دیکھتے، مولانا کے منہ سے کس طرح پھول جھڑ رہے ہیں۔ لطیفوں پر لطیفے دینی، سیاسی، ادبی، علمی، شخصی، ہر قسم کے تذکرے اور تبصرے۔ لطیف و شگفتہ ایک سے بڑھ کر ایک، کہیں شعر سنا رہے ہیں، کہیں بول چال کی نثر کو شعر بنائے ہوئے ہیں اور طبیعت کی آمد ہے، کہ بس پکار رہی ہے۔

ہے زباں میری ابرِ گوہر بار

گھنٹوں نہیں، پہروں بیٹھیے، اور دل نہ گھبرائے، نہ اُکتائے، نہ پچھتائے۔

اور جو کہیں موقع اس کا آگیا کہ چوٹ مولانا کے ضمیر اخلاقی یا حسِ دینی پر پڑی، تو چاہے وہ خلوت ہو یا جلوت، تخلیہ ہو یا مجمع، تحریر ہو یا تقریر، اب سماں ہی دوسرا۔ ایک شیر ہے کہ گرج رہا ہے۔ اِٹنا ہے یا وِسو ویس[1] کہ دلائل کی، خطابت کی آگ برسا رہا ہے اور زبان ہے کہ اب پھر صدا لگائے ہے، کہ

ہے قلم میرا تیغِ جوہر دار!

لیکن جوش و خروش کے عالم میں بھی، شروع جوانی کے دَور کو چھوڑ کر قلم یا زبان قابو سے باہر نہیں۔ قابو کے اندر۔ نطق پر اور نفس پر جیسے پہرا لگا ہوا۔ اشتعال کے سمندر سے جیسے لہریں اُٹھ رہی ہیں، اور علم و متانت کی چٹان سے ٹکرا کر واپس چلی جا رہی ہیں!

---

[1] اِٹنا اور وِسو ویس اٹلی کے دو مشہور آتش فشاں پہاڑ ہیں جن سے آگ نکلتی اور شعلے برستے رہتے ہیں۔

ایک دفعہ کی بہار سنیے! لیکن چشم تصور کے سامنے زمانہ آج سے ۴۳ سال قبل ۱۹۲۰ء کا لے آئیے۔ وقت تحریک خلافت و تحریک ترک موالات کی بھرپور جوانی کا۔ بچہ بچہ کی زبان پر خلافت کے پُرجوش نعرے اور "جان بیٹا خلافت پہ دے دو" کے ترانے۔ لیکن یو، پی ہی کا ایک معلوم و معروف دینی مرکز اینٹی خلافت مرکز بھی، اس کے مفتی کا حکم کہ تحریک خلافت حدُود کفر میں داخل۔ اور اس کے علمبردار دائرۂ اسلام سے خارج۔ ادھر خلافت والوں کو یہ سوجھی کہ اپنی ایک کانفرنس عین اسی شہر میں کیجیے —— اچھا صاحب! جلسہ ہوا، اور گویا مخالفین کے طبل جنگ پر چوب پڑ گئی۔ مخالفین بیڑا اٹھا کر چلے، کہ آج ہر عام جلسہ کو درہم برہم کیجیے۔ اور بیڑے کو غرق ہی کر کے واپس آئیے۔ اور جبائے خلافت کے دامن کو اپنی مقراضِ تکفیر سے تار تار کر کے رکھ دیجیے! —— ادھر خلافت والے بھی فکرمند کہ آج تو

ہے سانپ کے منہ میں انگلی دینی!

انجام دیکھیے کیا ہو۔ مناظرہ، ٹکراؤ، تصادم تو رکھا ہی ہوا ہے۔

لیجیے جلسہ شروع ہو گیا۔ مخالفین کی طرف سے میدان خطابت کا ایک پہلوان، شہ زور اور سیلتن اکھاڑے میں اتارا گیا۔ کشتی پر کشتی مارے ہوئے داؤں پیچ کی استادی میں نام پائے ہوئے۔ اور اس نے تقریر یہ مارا وہ مارا کے انداز میں شروع۔ جلسہ پر ایک نشہ کی سی کیفیت طاری اور خلافت والوں کی زبان پر وظیفے یا حفیظ کے جاری! اب یاد نہیں کہ صدر جلسہ خود مولانا ابوالکلام ہی تھے یا کوئی اور۔ بہرحال جوابی تقریر کے لیے وہی لا کھڑے ہوئے۔ لوگ سمجھے کہ لوہے کی کاٹ کے لیے لوہا نکلا۔ اور بس کوئی دم میں اینٹ کے جواب میں پتھر چلا۔ ادھر پولیس ہر طرح لیس، ہنگامے فساد کی منتظر، ہلڑ گلڑ کی متوقع۔ لیکن —— لیکن —— یہ کیا! تقریر تو شروع ہو کر ختم بھی ہو گئی۔ اور کہیں نہ تکفیر نہ تفسیق! اور یہ تو بہت دور کی چیزیں ہیں، نہ تعریض، نہ تشنیع نہ تضحیک نہ تفضیح! شروع سے آخر تک بس تفہیم و تذکیر تشریح تبیین۔ نہ مناظرہ نہ مفاخرہ نہ مکابرہ نہ مجادلہ! تقریر دلائل و حقائق کے رنگ میں رنگی ہوئی معقولیت اور سلامت روی کے پھولوں میں گندھی ہوئی! —— حریف اب کرتا بھی تو لڑتا سارے ارمان پھٹپھٹا کر رہ گئے۔ غالب کے پرزے اڑنے کی جو خبر گرم تھی وہ مولانا

۔کے حلم و تدبر کے آگے سرد ہو کر دھری کی دھری رہ گئی۔ اور تماشا ہو ہی نہ پایا!

تیغِ حلم از تیغِ آہن تیز تر

بل ز صد لشکر ظفر انگیز تر

شعر پڑھا مثنوی میں تھا۔ اس کا سماں آنکھوں سے دیکھ لیا۔

قدرت نے گویا پیدا ہی بڑائی کے لیے کیا تھا۔ کم سن ہی تھے کہ تحریر و تقریر دونوں کا شہرہ بلند ہو گیا۔ اور دور والے اس دھوکے میں پڑے رہے کہ یہ لڑکا کوئی بوڑھا ہوگا! اور شاگرد تو علوم و فنون میں کہنا چاہیے کہ کسی کے بھی نہ ہوئے۔ فیض بس مبدءِ فیض سے پائے ہوئے۔ رسماً کچھ کسی سے پڑھ پڑھا لیا ہو تو اور بات ہے، ورنہ حقیقتہً شاگردی کے نام سے نا آشنا اور مصداق

شاگردِ رشیدِ حق تعالےٰ

کے بنے ہوئے!

"خدنگ نظر" لکھنؤ کا ایک ادبی ماہ نامہ تھا۔ اس کے صفحات پر جب نظر آئے تو خود ہی مرکزِ نظر بن گئے۔ لسان الصدق کلکتہ سے نکالا، تو وقت کی صحافت میں چار چاند لگا دیے۔ الندوہ کے کوچۂ علم و فضل میں جب آ نکلے تو ایڈیٹر بنے بغیر ہی ایڈیٹر بن گئے۔ جب وکیل (امرتسر) کو ہاتھ میں لیا۔ تو اس کا نام دور دور چمکا دیا۔ اور یہ تو سب اُس سن کی باتیں ہیں۔ جب لڑکے کالج کے درجوں میں پڑھتے ہوتے ہیں۔ جب کلی کے پھول بننے کا وقت آیا اور اپنا ذاتی ہفتہ وار کلکتہ کے اُفق سے آب و تاب کے ساتھ نکالا، تو

چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے

یہ نام کا الہلال چند ہی روز میں ماہ دو ہفتہ یا بدر کامل تھا۔ انگلیاں ہر طرف سے اٹھنے لگیں۔ اور مرحبا اور خوش آمدید کے پھول ہر شہر اور ہر قریہ سے برسنے لگے۔

تقریر و تحریر کی جامعیت جیسی اس بھرپور شخصیت کے حصہ میں آئی، کمتر ہی کسی کے نصیب میں آئی، خطابت میں اپنی نظیر آپ تھے۔ اردو میں خطابت کا ریکارڈ قائم کر دیا۔ صبحِ زندگی

سے لے کر شامِ حیات تک، سیکڑوں نہیں، ہزاروں تقریریں کر ڈالیں۔ ہر تقریر انتخاب، بلکہ اپنی جگہ لاجواب۔ مخالفین کے مجمع میں یہ جوہر اور زیادہ چمکتا اور ان کے ہوائی قلعوں کو دم کے دم میں بٹھا دیتا۔ جواب کے لیے چلا ہوا لفظ ہمارے عوام کیا، خواص کی زبان پر بھی "دندان شکن" ہے۔ لیکن ابوالکلام کی تقریر نے نہ کسی کا دانت توڑا نہ جبڑا۔ کانوں کی راہ سے سیدھی دل میں اترتی اور وہیں اپنی جگہ بنا لیتی۔

تحریر و انشاء میں اپنے اسلوب کے موجد بھی تھے اور خاتم بھی، شروع میں اسلوبِ بیان ذرا ثقیل تھا اور کتاب، تذکرہ میں تو ثقیل سے گزر کر اثقل ہو گیا ہے۔ لیکن جہاں جاذبیت نے رفاقت اس حال میں نہ چھوڑی۔ رفتہ رفتہ ثقل لطافت میں تبدیل ہو گیا۔ غبارِ خاطر و کاروانِ خیال شگفتہ بیانی کے ماڈل یا مجسم نمونے ہیں۔ دین کی خدمت علمی رنگ میں اپنی تفسیر کے ذریعہ سے بھی کی۔ اور متعدد فقہی رسالے جو اپنی یادگار چھوڑ گئے۔ وہ اس کے علاوہ ——— ان کی ادبی شخصیت کی وسعت اور بلندی دونوں کا پوچھنا ہی کیا۔ ہزارہا صفحات پر چھاپ لگی ہوئی، ان کی انفرادیت کی، ان کے قلم کے بانکپن کی، ان کی خدمتِ تخلیق کی۔ زبان کے باب میں کیا ملکہ لے کر آئے تھے! لکھنؤ میں مستقل قیام کچھ زیادہ لمبا نہیں رہا تھا۔ چند مہینے ہی تو شاید رہے تھے۔ لیکن زبانِ لکھنؤ کی نزاکتوں پر وہ عبور حاصل کر لیا، کہ جیسے سدا کے لکھنوی ہوں!

سیاسیات کے کوچہ میں قدم رکھا، تو دیکھتے ہی دیکھتے صفِ اوّل کے لیڈروں میں شمار ہونے لگے۔ نوبت یہ پہنچی کہ سردار پٹیل سے اپنا لوہا منوا لیا۔ اور گاندھی جی اور جواہر لال تو جیسے ان کا کلمہ ہی پڑھنے لگے۔ کلمہ ان کے پُرجوش خطابت کا نہیں۔ کلمہ ان کی فہم و فراست کا، دانش و بینش کا، دور بینی اور تدبّر کا ——— کسی دوسرے کی شخصیت سے مرعوب بلکہ متاثر ہونا تو شاید ابوالکلام نے عمر بھر جانا ہی نہیں۔ الٹے اپنی ہی شخصیت سے دوسروں کو متاثر کرتے رہے۔ نظریاتی اختلاف کیا دینی اور کیا سیاسی، اپنے معاصرین میں خدا معلوم کتنوں سے تھا، وہ ہونا بالکل قدرتی تھا۔ لیکن اپنے ذاتی تعلقات میں فرق نہ کسی دینی اختلاف سے آنے دیا نہ کسی سیاسی اختلاف سے۔ اور نہ اپنی طرف سے کسی اختلاف کو

مخالفت میں تبدیل ہونے دیا ــــــ حیدر آباد میں پولیس ایکشن کے بعد جو انقلاب آیا۔ اس کی لپیٹ میں آگرہ قریب تھا کہ عربی زبان اور اسلامی علوم کا نادر و نامور ادارہ دائرۃ المعارف گردش روزگار کی نذر ہو جائے۔ عین وقت پر ابو الکلام کی شخصیت آڑے آئی۔ اور اس نے اس بین الاقوامی ادارہ کو قائم و محفوظ رکھ کر بھارت کی سیکولرازم کا بھرم قائم رکھا۔ اور اپنے ملک و وطن کی نیکنامی پر آنچ نہ آنے دی۔

(صدق جدید، ۲۲ نومبر ۱۹۶۳ء)

سلسلۂ ادبی تخلیقات

مولانا آزاد

(نشریہ لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے ۳۰ مئی کو بوقت ۸ بجے شب)

"سب سے پہلا مسئلہ باورچی کا پیش آنا تھا، اور پیش آیا"۔

یہ کب؟ اور کہاں؟ جب مولانا شاہی قیدی کی حیثیت سے اور ایک شاہانہ آن بان کے ساتھ قلعہ احمد نگر میں اگست ۴۲ء میں نظر بند ہوئے اور یہ فقرہ خود مولانا نے اپنے قلم سے اپنے حبیب صمیم مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کو ۱۹ اگست کے مکتوب میں لکھا ہے۔ پورا بیان اب انھیں کی زبان سے سنیے:

"دوسرے دن کیا دیکھتا ہوں کہ ایک جیتا جاگتا انسان اندر لایا گیا۔ معلوم ہوا کہ طباخ موعود یہی ہے، مگر نہیں معلوم اس غریب پر کیا بپتی تھی کہ آنے کو تو آگیا، لیکن کچھ ایسا کھویا ہوا اور سراسیمہ حال تھا جیسے مصیبتوں کا پہاڑ اس پر ٹوٹ پڑا ہوا۔ اور وہ کھانا کیا پکاتا اپنے ہوش و حواس کا مسالہ کوٹنے لگا"۔

عبارت مولانا ابوالکلام کے قلم جادو رقم کی ہے۔ اور ان کی کتاب غبار خاطر کے صد ۵۵ سے نقل ہوئی، مولانا دہلی کے تھے، لکھنؤ کے نہ تھے۔ بول چال محاورہ، روزمرہ، سارا ٹھاٹھ دہلی والوں کا۔ لیکن دیکھ لیا آپ نے لکھنؤ کا رنگ بھی کس بانکپن سے اپنا لیا! اور باورچی سے کیا بے ساختہ اس کے ہوش و حواس کا مسالہ کھڑے کھڑے کٹوا لیا! سبحان اللہ! اور ابھی کیا ہے۔ اس مسالے کا چٹپٹا پن آگے ملاحظہ ہو:

"قید خانے میں جو اسے ایک رات دن قید و بند کے توے پر سینکا گیا، تو ہونے تلنے کی ساری ترکیبیں بھول گیا، اس احمق کو کیا معلوم تھا کہ ساٹھ روپیہ کے عشق میں یہ پاپڑ بیلنے پڑیں گے۔ اس ابتدائے عشق ہی نے کچومر نکال دیا، قلعہ تک پہنچتے پہنچتے

قلیہ ہی تیار ہو گیا۔"

اور میں عرض کرتا ہوں کہ اگر کہیں مولانا نے اس سے قلیہ تیار کرنے کی فرمائش کر دی ہوتی، تو عجب نہیں کہ اسی دم اس کی قلیا تمام ہو جاتی!

غالب کی طرح مولانا بھی رعایت لفظی اور صفت مراعاۃ النظیر کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھرنے والے تھے۔ لیکن آخر ذوق زبان کے مارے ہوئے تھے اور لطف بیان کے گھائل۔ ایسے چٹخاروں سے بچ کر کہاں جا سکتے تھے۔ بہ قول شخصے ع

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے!

غالب ہی کی طرح جب کبھی اس شجر ممنوعہ کو ہاتھ لگایا، تو جسد بے جان میں روح پھونک دی، پتھر کو ہیرا بنا دیا۔ آبنوس کو کندن کی طرح چمکا دیا۔ ذرۂ بے نور کو آفتاب کی تپش و تابش دے دی!

ادب عالیہ یا کلاسیکس کی اصطلاح تو اُردو میں بعد کو چلی ہے باقی یہ کلاسیکل یا عالی قدر ادب تو مولانا کا جیسے حصہ تھا۔ ان کے قلم کا شروع سے ایک امتیازی خاصہ تھا۔

تیور مردانہ، لہجہ شریفانہ، ترکیبوں میں جزالت، الفاظ میں جلالت، تشبیہوں میں جدت، استعاروں میں ندرت، خیال میں بلندی، بیان میں صفائی، مطالب فکر انگیز، اسلوب ولولہ خیز، نثر ہر جگہ ادیبانہ، کہیں خطیبانہ، خطابت کا مزاج شاہانہ، عبارت کی سطح کہیں حکیمانہ، کہیں حاکمانہ، حکمت کی جگہ حکمت، ظرافت کے محل پر ظرافت، حکایتِ غم و حزن ہو یا داستانِ سرور و نشاط، لطافت و شادابی سطر سطر سے عیاں، اور آمد اور بے ساختہ پن لفظ لفظ سے نمایاں، مطالعہ میں گہرائی، مشاہدہ میں گیرائی، بات میں بات پیدا کرنے کا دہ سلیقہ اور معمولی جزئیات سے دور رس نتائج نکالنے کا وہ ملکہ کہ دھوکہ، حضرت رومی کی مثنوی کے دفتروں کا ہونے لگے۔

دین و مذہب مولانا کے قلم کا موضوع خصوصی سالہا سال تک رہا، الہلال، البلاغ کے سارے صحافتی اور کتاب تذکرہ کے تصنیفی دور کا حرف اول بھی یہی ہے۔ اور حرف آخر بھی یہی۔ بائے بسم اللہ بھی یہی اور تائے تمت بھی یہی۔ خشکی مذہبی تحریروں کا ایک

لازمی جزو سمجھ لی گئی ہے۔ مولانا کا قلم اس علت سے کوسوں کیا منزلوں دور رہا۔ یہاں تک کہ جن فقہی عنوانات پر مولانا نے قلم اٹھایا ہے۔ انھیں بھی گل و گلزار بنا کر چھوڑا ہے۔
قادر الکلام کا لفظ ہمارے یہاں شاعروں ہی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ نثر نگاروں میں کسی پر اس کا اطلاق اگر پوری طرح ہو سکتا ہے تو وہ ابوالکلام کی ذات ہے۔ مضمون خوشی کا ہو یا غم کا، داستان رزم کی ہو یا بزم کی، موضوع علمی ہو یا شعری، عنوان سیاسی ہو یا فلسفیانہ، یہ سدا بہار قلم ہر انداز بیان، ہر اسلوب نگارش، ہر پروازِ فکر پر یکساں قادر۔ غبار خاطر کہنا چاہیے کہ ان کی سب سے آخری کتاب ہے۔ اسے جو کھولا۔ تو اتفاق سے صفحہ ۶۴، ۶۵ کھل آیا۔ تو لیجیے اسی کا ایک ٹکڑا اسماعت میں لے آئیے:

"غور کیجیے تو یہ بھی ہمارے وہم و خیال کا ایک فریب ہی ہے کہ سر و سامان کار ہمیشہ باہر ہی سے ڈھونڈھتے رہتے ہیں۔ اگر یہ پردۂ فریب ہٹا کر دیکھیں تو صاف نظر آتا ہے کہ وہ ہم سے باہر نہیں ہے۔ خود ہمارے اندر ہی موجود ہے۔ عیش و مسرت کی جن گل شگفتگیوں کو ہم چاروں طرف ڈھونڈھتے ہیں۔ اور نہیں پاتے، وہ ہمارے نہاں خانۂ دل کے چمن زاروں میں ہمیشہ کھلتے اور مرجھاتے رہتے ہیں۔ لیکن محرومی ساری یہ ہوئی کہ ہمیں چاروں طرف کی خبر ہے۔ مگر خود اپنی خبر نہیں۔ و فی انفسکم افلا تبصرون۔ جنگل کے مور کو کسی باغ و چمن کی جستجو نہیں ہوتی۔ اس کا چمن خود اس کی بغل میں موجود رہتا ہے۔ جہاں کہیں اپنے پروں کو کھول دے گا۔ ایک چمنستان بوقلموں کھل جائے گا۔ قید خانے کی چار دیواری کے اندر بھی سورج ہر روز چمکتا ہے۔ اور چاندنی راتوں نے کبھی قیدی و غیر قیدی میں امتیاز نہیں کیا۔ صبح جب طلاشیر بکھیرتی ہوئی آئے گی اور شام جب شفق کی نیلگوں چادریں پھیلانے لگے گی، تو صرف عشرت سرا ہی کے دریچوں سے ان کا نظارہ نہیں کیا جائے گا، قید خانے کی دیواروں سے لگی ہوئی نگاہیں بھی انہیں دیکھ لیا کریں گی۔"

اخذ و اقتباس کے اس ننھے سے آئینے میں آپ نے انشائے ابوالکلام کی دلآویزیوں

کی جھلک دیکھ لی۔ ان کے ہزارہا صفحات کے دفترِ انشا میں سب اسی کی بسط و تفصیل ملے گی۔ ان کا قلم ہر رنگِ تحریر پر قادر بے شبہ رہا، لیکن ایک چیز کا استثنا رہ ہی گیا۔ وہ اب سن لیجیے۔ جس میدان میں ان کا رہوارِ قلم دوڑنے کیا چلنے سے بھی معذور رہا، اس کا نام ہے کرختگی یہ نہیں کہ انہیں غصہ آتا نہ ہو لیکن عتاب بھی لطفِ خطاب سے خالی اور رنگِ جلال پرتوِ جمال سے عاری نہ ہوتا۔

ایک خیال یہ ہے کہ مولانا کے مرقع میں درد و الم، غم و حزن کی مصوری درجۂ کمال کی نہیں ملتی۔ لیکن یہ خیال کچھ یوں ہی سا ہے۔ اظہارِ غم کے طریقے ہم سب میں یکساں کب ہیں؟ کوئی بے اختیار ہو کر چیخنے چلانے لگ جاتا ہے۔ کسی کو دہاڑیں مار کر رونا آنے لگتا ہے اور کسی کے منتہائے غم کی مقدار ہے چند سسکیاں اور پھر خاموشی۔

مولانا کے بھی دلی غم و حزن کی ترکیب میں عنصر اسی متانت و خودداری کے شامل ہیں۔ اپنی رفیقۂ حیات بی بی زلیخا کو بیمار چھوڑ کر قلعہ احمد نگر میں نظر بند ہوئے۔ خبر انتقال پا کر اپنے ایک عزیز دوست کو لکھتے ہیں۔ تو دیکھیے کس خاموش پُر اثر انداز میں:

"۳۱ اگست کو جب میں بمبئی کے لیے روانہ ہونے لگا، تو وہ حسب معمول دروازہ تک خدا حافظ کہنے کے لیے آئی۔ اس نے خدا حافظ کے سوا اور کچھ نہیں کہا۔ لیکن اگر وہ کچھ کہنا بھی چاہتی تو اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔ جو اس کے چہرہ کا خاموش اضطراب کہہ رہا تھا اس کی آنکھیں خشک تھیں۔ مگر چہرہ اشکبار تھا، گزشتہ ۲۵ برس کے اندر کتنے ہی سفر پیش آئے۔ اور کتنی ہی بار گرفتاریاں ہوئیں لیکن اس درجہ افسردہ خاطر میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔۔۔۔۔ شاید وہ محسوس کر رہی تھی۔ کہ اس زندگی میں یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ وہ خدا حافظ اس لیے نہیں کہہ رہی تھی کہ میں سفر کر رہا تھا۔ وہ اس لیے کہہ رہی تھی کہ وہ خود سفر کرنے والی ہے۔۔ ۔۔ ۲۲ مارچ کو مجھے پہلی اطلاع اس کی خطرناک علالت کی ملی۔۔۔۔ بالآخر ۹ اپریل کو زہرِ غم کا یہ پیالہ لبریز ہو گیا۔۔۔۔۔ اس طرح ہماری ۳۶ برس کی

ازدواجی زندگی ختم ہوگئی۔ اور موت کی دیوار ہم دونوں میں حائل ہوگئی .... ہم اب بھی ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں۔ مگر اس دیوار کی اوٹ سے! یہاں ایک احاطے کے اندر ایک پرانی قبر ہے۔ نہیں معلوم کس کی ہے، جب سے آیا ہوں۔ سیکڑوں مرتبہ اس پر نظر پڑ چکی ہے۔ لیکن اب اسے دیکھتا ہوں، تو ایسا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے ایک نئی طرح کا اُنس اس سے طبیعت کو پیدا ہوگیا ہے۔ کل شام کو دیر تک اسے دیکھتا رہا۔" (ص ۲۸۲ ص ۲۸۳)

لیجیے وقت مقررہ میں سے ساڑھے نو منٹ ختم ہوگئے: یعنی آدھے منٹ میں س اتنا سن لیجیے، کہ خدانخواستہ اگر ادبیات اُردو کا سارا ذخیرہ جل کر خاکستر ہو جائے۔ اور تنہا ابوالکلام کی "تخلیقات" (یہ لفظ میرا نہیں ہے) باقی رہ جائیں تو ان شاء اللہ ادب اُردو کی عظمت وجلالت کا اندازہ لگانے کے لیے وہ بس ہوں گی۔ اور خدانخواستہ ابوالکلامیات کے بھی دوسرے اجزاء معدوم ہو جائیں تو ان کا بھی سارا عطر کھنچا کھنچایا ایک غبار خاطر کے اندر موجود ملے گا۔ اور خود یہ غبار خاطر عطیہ کس کا ہے؟ جیل کا! یوسف علیہ السلام تو پیغمبر تھے۔ مگر ان کے بھی جوہر کی جِلا جاکر کہاں ہوئی! قیدِ زنداں کی چہار دیواری کے اندر! تو حیرت نہ کیجیے کہ اس سنتِ یوسفی کا حق اپنی بساط بھر بی بی زلیخا کی ہم نام کے شوہر نے ادا کیا۔ جو اپنی نوجوانی میں خود یوسف جمال مشہور تھا! (صدق جدید۔ ۱۱ جون ۱۹۶۵ء)

یادیں: ابوالکلام آزاد

(نشریہ لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے ۱۶؍ جنوری ۱۹۶۶ء کی شام کو وقت ۶ منٹ)

یادش بخیر۔ سنہ آج سے ۴۵ سال قبل کا ۱۹۲۰ء ہے، اور مہینہ بھی کوئی اپریل، مئی کا۔ ایک روز دیکھتے کیا ہیں کہ ہمدم میں تبصرہ مولانا ابوالکلام کے قلم سے اردو کے ایک دیوانِ شعر و غزل پر نکلا چلا آرہا ہے —— ایں! یہ کون سے شاعر کا نصیبہ جاگا ہے؟ مولانا نہ پیشہ ور نقاد نہ پیشہ ور تبصرہ نگار۔ وہ تو کوئی ایسا ہی قسمت کا دھنی ہوتا ہے۔ جو اپنی کتاب پر ان کے قلم سے کچھ موتی اگلوا لیتا ہے —— اچھا یہ ہیں ہمارے شہر کے معروف و ممتاز شاعر، خوش گو، خوش فکر اور اب کہیے کہ خوش نصیب، مرزا محمد ہادی عزیزؔ۔ انہیں کا تو دیوان گلکدہ کے نام سے نیا نیا نکلا ہے۔ اور گھر گھر چرچا اسی کا ہو رہا ہے۔ ہمدم کوئی ادبی رسالہ نہیں، روزنامہ ہے۔ اور اس وقت اُردو میں چوٹی کا۔ مدیر شہیر سید جالبؔ دہلوی، شاگرد داغؔ و حالیؔ۔ ان کے قلم کی آبیاری نے خشک صحافت کی زمین میں شعر و ادب کے گل بوٹے بھی کھلا رکھے ہیں!

خیر، دیکھیے تو تبصرہ میں ہے کیا؟ خاصی داد، خاصی تحسین، خاصی جوہر شناسی، لیکن ایک ہلکی سی جھلک نقد و ایراد کی بھی۔ گرفت صرف دو لفظوں پر، ایک لفظ 'مستی'، پر اس مطلع میں ؎

سامنے آئینہ تھا مستی تھی ان پہ اک شانِ خود پرستی تھی

مولانا کا فرمانا تھا کہ مستی کا لفظ علاوہ شراب کی مستی کے لکھنؤ کی زبان میں ایک پہلو ذم کا بھی رکھتا ہے۔ اور ثقہ شاعر کو اس بے احتیاطی سے بچنا تھا۔

اور دوسرا لفظ، تحریک، شاعر کی ایک فارسی غزل کے اس شعر میں ؎

چوں بہ تحریکِ مشیت عشق شد مسند طراز
خندۂ صبحِ ازل جا در گریبانم گرفت

اس پر مولانا کا ارشاد ہے کہ "تحریک" اس اُردو مفہوم میں فارسی میں نہیں آتا۔

لیجیے، شعر و ادب کے زور آوروں کو ایک نیا شگوفہ ہاتھ آگیا اور بحث و مباحثہ کا پورا دنگل قائم ہوگیا۔ پہلا جواب خود عزیزؔ صاحب کا نکلا۔ "تحریک کے جواز میں عرفیؔ کی سند پیش کردی۔ البتہ مستی کی بات، کہنا چاہیے کہ پوری طرح نہ بن پائی۔ لکھنؤ کے ماہ نامہ صبح امید (چکبست والے) اور لاہور کے ماہ نامہ مخزن (شیخ عبدالقادر والے) ہیں اور پنجاب اور یوپی کے خدا معلوم کتنے رسالوں میں دونوں فریقوں کے شہسوار اپنے دست و بازو کے کرتب دکھاتے رہے ——— بحث کے نتیجہ سے یہاں کوئی بحث نہیں۔ اور نہ اس سے غرض کہ بالآخر مصرِ سخن کا عزیزؔ کون ثابت ہوا، اور یوسفؔ کون۔ غرض صرف یہ کرنا ہے کہ عزیزؔ تو ٹھہرے خاص الخاص لکھنوی اور مسلّم اہل زبان۔ ان کی زبان پکڑنے کی ہمت اور وہ بھی خالص لکھنوی روزمرہ کے رُخ سے۔ کس کے بس کی بات تھی؟ اور مولانا کی لکھنویت کی کل کائنات ان کا چھ یا سات مہینہ کا قیام لکھنؤ! اور خیر، یہ معاملہ تو پھر اردو ہی کا تھا مولانا کی نظر تو ایسی ہی گہری اور انھیں باریک بینیوں کے ساتھ فارسی اور عربی کے بھی ادبی خزانوں پر تھی۔ جیسے ان کی آنکھ ہی ان زبانوں کے گہوارے میں کھلی ہو!

اور یہ تو یہ۔ حد ہے کہ انگریزی زبان پر عبور محض ذاتی مطالعہ کی مدد سے حاصل کرلیا۔ اور وہ بھی اپنے ڈھلتے ہوئے شباب کی منزل پر پہنچ کر! یہ ایک اعجوبہ سے کم نہیں ——— کسی کی کنیّت کیوں اتنی اسم بامسمّٰی ثابت ہوئی ہوگی۔ ابوالکلام صرف نام کا ابوالکلام نہ تھا۔

یہ سرگزشت تو ہوئی زبان و ادب کی۔ اب رہے وہ علم جو خالص دینی سمجھے جاتے ہیں اور مولوی مولانا صاحبان کی ملک خصوصی مثلاً تفسیر و حدیث، فقہ و کلام، تو یہاں بھی آپ تذکرہ اور ترجمان القرآن کے مصنف کو علم و فضل تدریس و تحقیق کی جس مسند پر جی چاہے، بٹھا دیجیے۔ کہیں بھی ان کی نظر نیچی ہوتے آپ نہ پائیں گے۔ حیرت کا منظر اس سے بھی بڑھ کر اس گھڑی پیش آتا، جب آتا، جب آپ ان سے فرمایش کرتے کہ حضرت فرنگی فلسفہ و عقلیات کی فلاں سوسائٹی کے لیے آپ ایک خطبۂ صدارت ارشاد

فرادیں۔ اور مولانا اس امتحان میں بھی پاس ہو کر رہتے! خدا جانے اُن کے کانوں نے کہاں کہاں کی آوازیں سن رکھی تھیں۔ ان کی آنکھیں کن کن عالموں کے جلوے دیکھ چکی تھیں اور ان کے دل و دماغ کن کن حقیقتوں کو سوچ سمجھ کر اپنے اندر محفوظ کر چکے اور اپنے میں جذب کر چکے تھے —— گویا ایک عجیب و غریب گراموفون بشری شکل و قالب میں تھا، کہ جب اور جو ریکارڈ چاہا کھلوا کر اس سے سن لیا!

رہی سیاسی سوجھ بوجھ اور سیاسیات کے برتنے کا عمل، کیا اپنوں سے، اور کیا بیگانوں سے، کیا خواص سے، اور کیا عوام سے، تو جس ذات کا دم گاندھی جی اور پنڈت جواہر لال بھرتے ہوں۔ اور جس کا نام سیاسی اُتار چڑھاؤ کی ہر منزل میں اور ہر مرحلہ پر پیش پیش رہتے ہوں۔ اس کی حکایت کوئی عامی کرے تو کیا کرے۔ اور تحریکِ خلافت و ترکِ موالات ( ) تو درحقیقت ایک انقلابی تحریک تھی۔ اس میں اسلامی ہند نے جن تین بڑی ہستیوں کو مرتبۂ امامت پر رکھا تھا۔ ان میں ایک ذات ابوالکلام کی بھی تھی۔ ہاں وہی ابوالکلام جن کے ذکر کے ختم پر حسرت موہانی کا یہ شعر بھی اپنے حافظہ میں تازہ کر لیجیے ؎

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر نظمِ حسرت میں بھی مزہ نہ رہا

(صدق جدید۔ ۱۸ فروری ۱۹۶۶ئہ)

مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت

نشریہ لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے ۲۵ر فروری ۵۳ء کی شام کو ۸ بجے

ایک نہیں، تین تین بار مولانا ابوالکلام کے نام نامی کی آڑ میں ریڈیو کے دسترخوان پر اُبلی ہوئی اور خشک، پھیکی سیٹھی، کھچڑی پیش ہو چکی ہے، اور اب چوتھی بار قدر افزائی اور سرفرازی کے دربار سے حکم ملا ہے کہ وہی اناڑی بکاول یا بھنڈاری، پھر ایک بار اپنا وہی کچا پکا دال دلیا پیش کرے جس میں زبان کو قورمہ اور بریانی کی لذت آئے۔ اور ذائقہ اس سے من وسلویٰ کا لطف اٹھائے!

عرب کا تو ذکر نہیں، ہندوستان میں اور کسی پر یہ گزری ہے کہ نام ولقب ماں باپ کا رکھا ہوا، اور کنبہ اور گھر میں پکارا، اور چلایا ہوا، احمد محی الدین تو گمنامی اور بے نشانی کی نذر ہو جائے اور کنیت ابوالکلام شہرت کے پنکھوں سے اڑے۔ اور کیا دشمن اور کیا دوست سب کی زبانوں پر، دلوں پر، دماغوں پر ہر طرح یہی چڑھ کر رہے!

مولانا کی پیدائش ۱۸۸۸ء کی ہے۔ سن ابھی ۱۵، ۱۶ سال کا تھا کہ اہل نظر کی نظروں میں آنے لگے، اور جانے پہچانے سنجیدہ مضمون نگاروں میں گنے جانے لگے۔ ۱۹۰۳ء اور ۱۹۰۴ء ہوگا کہ کلکتہ سے ایک ماہ نامہ "لسان الصدق" کے نام سے خود نکالا، اور دس بارہ پرچے اس کے نکالے، اور لکھنؤ سے ایک سیاسی، ادبی ماہ نامہ "خدنگِ نظر" کے صفحات پر ادبی تیراندازی کرتے نظر آئے۔

۱۹۰۵ء تھا کہ وقت کے مشہور علمی، ادبی، تاریخی، دینی ماہنامہ "الندوہ" میں حصہ لینے لگے۔ پرچہ تاریخی ادارے ندوہ کا ترجمان عالی شان تھا۔ اور ایڈیٹر تھے مشہور، مورخ و ادیب مولانا شبلی نعمانی اور اُن کے رفیق کار اُن کے ہم قافیہ مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی۔ "الندوہ" کی مضمون نگاری کوئی آسان بات نہ تھی۔ کسی مضمون کا اس میں ایک مرتبہ

بھی بار پا جانا ایک مستقل ضمانت تھی، مضمون کی پختگی کی، اور مضمون نگار کی پختہ مغزی کی، یہاں مضمون اتنی تکرار اور اس تواتر کے ساتھ نکلے کہ بہت سے پڑھنے والے اس دلچسپ دھوکے میں پڑ گئے کہ مولانا شبلی کو یہ ابوالکلام ہاتھ آ گئے یہ کوئی شبلی ثانی۔ ان کے ہم قلم، ہم پیشہ، ہم مرتبہ! پرچہ کے مضمون نگار نہیں۔ ایڈیٹر!

ابوالکلام کے مبتدی ہونے کا دور اس "الندوہ" کی مضمون نگاری کے ساتھ ختم ہوا، اور وہ لکھنؤ سے امرتسر منتقل ہو گئے۔ مسلمانوں کے ملی پرچوں میں معروف و معتبر اکیلے پنجاب میں نہیں، بلکہ ہندوستان بھر میں تھا وکیل سہ روزہ۔ مولانا اس سے منسلک ہو گئے، اور اسی دور میں عراق وغیرہ کی سیاحت بھی کر آئے، اور یہ زمانہ سنہ ۶ و سنہ ۸ [۱] کا سمجھیے۔

بات کہتے سنہ ۱۲ء آ گیا۔ اور اب اپنا مستقل باتصویر ہفتہ وار الہلال کلکتہ سے نکالنا شروع کیا، الہلال اپنے شکل و شمائل میں، اپنے رنگ روپ میں، اپنی چمک دمک میں اپنی نظیر آپ تھا، اور اس کے طلوع ہونے سے مولانا کا دور وسطی شروع ہو گیا ہے۔ اب وہ بڑے مضمون نگار ہی نہ تھے بلکہ ایک اعلیٰ خطیب بھی تھے، اور ایک ذمہ دار قسم کے اور سوجھ بوجھ رکھنے والے لیڈر بلکہ بہت سے حلقوں میں صائب الرائے بھی، جلسوں کی قیادت، جلوسوں کی امامت، کانفرنسوں کی صدارت، اب یہ سب ان کا حصہ تھیں، تاریخ کا یہ دَور ملک کے خاص انقلاب کا تھا، اور مسلمانوں کے لیے تو علی الخصوص، پھر انقلاب بھی اگر ایک طرف سیاسی تھا، تو دوسری طرف مجلسی، علمی، عقلی اور تعلیمی بھی۔ کانگرس اپنے بچپن سے نکل کر اپنی جوانی کو پہنچ چکی تھی، اور کلکتہ ہی سے ایک انگریزی ہفتہ وار مولانا محمد علی کا مشہور و معروف کامریڈ، الہلال کے ساتھ مل کر اس انقلاب کی رہنمائی کر رہا تھا، سرکار عظمت مدار کی عظمت میں جھول پڑ چکا تھا، اور برطانیہ کی دولت مداری کے راگ بے ثمرے ہو چکے تھے، محمد علی کی طرح ابوالکلام نے بھی اپنا موضوع تاریخ نویسی نہیں رکھا، بلکہ تاریخ سازی کا بوجھ بھی اپنے سر لے لیا تھا۔ اب وہ ماضی کی داستان سرائیاں نہیں کر رہے تھے بلکہ حال و مستقبل کی سڑکیں بنا رہے تھے۔ ملک کو ملت کو

---

[۱] مولانا کے سفر عراق و مصر کا صحیح زمانہ سنہ ۹ سنہ ۸ کا ہے۔

قدم بڑھانے کا سبق دے رہے تھے۔ سرکار کی قصیدہ خوانیوں کے خیمے اکھڑ چکے تھے۔ اس کی اقبال مندی کے شامیانے پارہ پارہ ہو رہے تھے، اور نئے نئے جھنڈے اور علم آزادی و حقوق طلبی کے بلند ہو رہے تھے، ابوالکلام وقت کے ان تقاضوں کی مخلوق نہ تھے۔ کہنا چاہیے کہ ان کے خالق و بانی تھے۔ عین اسی زمانہ میں تحریک خلافت چھڑ گئی، اور گاندھی جی نے نعرہ ترک موالات یا نان کوآپریشن کا لگا دیا۔ یہاں یہ بات بھی کان میں سن لیجیے کہ لفظ ترک موالات جو ہے، اس کے مصنف و خالق مولانا ابوالکلام ہی تھے۔ سرکار کی طرف سے دھڑ پکڑ بھی خوب ہوئی، اور گرفتاریاں دھڑا دھڑ ہونے لگیں۔ ۱۹ء سے لے کر ۲۳ء ... تک خوب ہی گرما گرمی رہی۔ الہلال بند ہو چکا تھا۔ البلاغ نے مولانا کے آزاد ہوتے ہی[1] کچھ نہ کچھ حق الہلال کی جانشینی کا ادا کیا اور کچھ کام کر ہی گیا۔

مولانا کا شمار اب صف اول کے لیڈروں میں تھا۔ اصل اشتغال اب سیاسی ہو گیا، وہ سیاست ملکی اور سیاست ملی ہی کی علمبرداری کرتے رہے۔ لیکن یہ نہ سمجھیے کہ وہ اس ساری مدت میں مذہب و ادب کی طرف سے غافل رہے۔ ان کی معرکہ کی دو کتابیں عین اسی زمانہ کی ہیں۔ ایک تذکرہ (تصوف کے حقائق و دقائق میں) اور دوسری ترجمان القرآن (تفسیری حاشیے پارہ ۸ تک) ان دونوں میں مذہبیات سے متعلق اپنا دل کھول کر رکھ دیا ہے۔ اور ادب میں ان کا شاہکار غبار خاطر ہے۔ ان کی آخری اسیری ۱۹۴۲ء کے لپیٹ میں۔

گفتگو آدھی سے زیادہ ہو چکی۔ ریڈیو سننے والے اب تک ابوالکلام کے اصل کلام سے محروم ہی رہے ہیں۔ ختم سے قبل دو ایک منٹ اب اس کلام کے نمونے بھی سن لیجیے، پہلا نمونہ الہلال کا ہے۔ الہلال، البلاغ والے دور کا:

"ملکوں اور قوموں کی تاریخ میں ایک وقت آتا ہے۔ جب کہ انسانوں کے لیے زندگی کی خواہش معصیت ہو جاتی ہے۔ اور زندہ رہنے سے بڑھ اور کوئی جرم نہیں ہوتا جب کہ اونچی اونچی دیواروں اور آہنی دروازوں کی آبادی بڑھ جاتی ہے، اور آہنگر کی صنعت کی سب زیادہ مانگ ہوتی ہے، جبکہ

---

[1] البلاغ کے اجرا کا واقعہ مولانا کی گرفتاری سے پہلے کا ہے، رہائی پانے کے بعد کا نہیں۔

درختوں کی ٹہنیوں میں رسیاں لٹکائی جاتی ہیں، اور جب کہ لکڑی کے تختے بنائے جاتے ہیں، تاکہ ان پر فرزندان آدم کھڑے کیے جائیں۔"

اس عبارت پر تاریخ ۱۹۱۳ء کی پڑی ہے۔ اور دوسری کتاب "تذکرہ" کی ہے۔ زبان کے ثقل و اغلاق کے باعث ٹکڑا بہت ہی مختصر اً ملاحظہ ہو:

"اور ہر اجرت جو فعل خبیث کی ہو، خبیث ہے، اور ہر عقد جس کا معقود علیہ حرام ہو وہ عقد باطل، بلکہ صرف اس لیے کہ باضابطہ طریق اجارہ کے مطابق عقد اجارہ نہیں ہوا، جس سے شبہ پڑ جاتا، اور جو کچھ اس کو دیا گیا وہ اس کا سبب شرط حق نہیں تھا۔"

خیال یہ ہے کہ مولانا کے انانیت پسند ادب میں اور تو ہر پہلو موجود ہے، لیکن سوز و گداز موجود نہیں، لیکن اس خیال کی تردید کے لیے صرف وہ الفاظ سُن لیجیے، جن میں مولانا نے اپنی اہل خانہ کی وفات کا اپنی اسیریٔ احمد نگر کے زمانہ میں ذکر کیا ہے، سنیے:

"۳ راگست کو جب میں بمبئی کے لیے روانہ ہونے لگا تو وہ حسب معمول دروازہ تک خدا حافظ کہنے کے لیے آئی، میں نے کہا کہ اگر کوئی نیا واقعہ پیش نہیں آگیا تو ۱۳ راگست تک واپسی کا قصد ہے۔ اس نے خدا حافظ کے سوا اور کچھ نہیں کہا، لیکن اگر وہ کہنا بھی چاہتی تو اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتی تھی جو اس کے چہرے کا خاموش اضطراب کہہ رہا تھا، اس کی آنکھیں خشک تھیں، مگر چہرہ اشکبار تھا۔

گزشتہ ۲۵ برس کے اندر کتنے ہی سفر پیش آئے، اور کتنی ہی مرتبہ گرفتاریاں ہوئیں لیکن میں نے اس درجہ افسردہ خاطر اسے کبھی نہیں دیکھا تھا، کیا یہ جذبات کی وقتی کمزوری تھی، جو اس کی طبیعت پر غالب آگئی تھی؟ میں نے اس وقت ایسا ہی خیال کیا تھا لیکن اب سوچتا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ شاید اسے صورت حال کا ایک مجہول احساس ہونے لگا تھا۔ شاید وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس زندگی میں یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ وہ خدا حافظ اس لیے نہیں کہہ رہی تھی کہ میں سفر کر رہا تھا وہ اس لیے کہہ رہی تھی کہ خود سفر کرنے والی تھی۔"

(۲ ر مارچ ۴۳ء)

ابوالکلام[۱]

مولانا ابوالکلام کے نام سے آشنائی اس وقت ہوئی جب ۱۹۰۵ء میں ان کے مضمون الندوہ میں چھپنے لگے، میں شاید نویں درجے کا طالب علم تھا، اور الندوہ اور اس کے ایڈیٹر مولانا شبلی سے بہت ہی متاثر و مرعوب تھا۔ الندوہ میں کسی کا ایک آدھ مضمون چھپ جانا ہی اس کے علم و فضل پر ایک زبردست دلیل تھی چہ جائیکہ کئی کئی مضمونوں کا! ابوالکلام یقیناً کوئی مولانا شبلی ہی کے ٹکر کے "مولانا" ہوں گے اور اپنے کلّے ٹھلّے سے "مولانا" معلوم بھی ہو رہے ہوں گے۔ ان کے مضمونوں کی قدرت انشائی اور بلند آہنگی تو یہی کہے دیتی تھی۔ ۱۹۰۶ء میں لکھنؤ دارالعلوم ندوہ کا جلسہ دستار بندی قاعدہ عام کلب کی عمارتیں میں ہوا، میں سیتاپور سے آ کر شریک ہوا، مولوی سید سلیمان ندوی کا آخری سال تھا۔ انہوں نے اپنی برجستہ و امتحانی عربی تقریر میں کہیں یہ کہہ دیا کہ اسلام کی لازمی شرط تو کلمہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کا پڑھ دینا ہے۔ مولانا شبلی نے ٹوکا کہ ہاں پورا کلمہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ۔ معاً حاضرین میں سے ایک صاحب نے جو داڑھی والے اور "متین" تھے خود مولانا شبلی کو ٹوکا کہ آپ گڑبڑاتے ہیں، لڑکا ٹھیک تو کہہ رہا ہے۔ حدیث میں آچکا ہے مَنْ قَالَ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ دَخَلَ الْجَنَّۃَ۔ دل نے کہا کہ یہ صاحب یقیناً مولانا ابوالکلام ہی ہونگے، ان کے سوا اور کس میں اتنی ہمت ہو سکتی ہے کہ مولانا شبلی کو ٹوک دے۔ خیال تمام تر غلط نکلا۔ ابوالکلام اس وقت تک اس سن سال کے بھی نہ تھے، اور چہرہ بالکل صاف رکھتے تھے، داڑھی اول تو تھی ہی کہاں اور بہر حال جتنی تھی بھی، اُسے رکھنا بھی شروع نہیں کیا تھا ــــ حکایت سے اندازہ صرف اس کا کیجیے کہ شبلی کی طرح ابوالکلام کا بھی رعب دل

---

[۱] یہ مولانا دریا بادی کی آخری زمانے کی تحریر ہے اور ان کے انتقال کے بعد معاصر شخصیات پر شائع ہونے والے مجموعۂ مضامین "معاصرین" کلکتہ، ۱۹۷۹ء میں شامل ہے۔

پر کتنا بیٹھا ہوا تھا۔

۱۹۰۹ء تھا کہ میں کیننگ کالج کا طالب علم تھا کہ ایک دن، دن کے وقت لکھنؤ اسٹیشن کسی کو رخصت کرنے گیا۔ دیکھا کہ ایک نوجوان، وجیہہ، شکیل، داڑھی مونچھ صاف، سکنڈ کلاس (آج کے فرسٹ کلاس) ویٹنگ روم سے باہر نکلا، غالباً سگریٹ منہ میں دبا ہوا۔ کالا ترکی کوٹ اس کے گورے رنگ پر بڑا ہی بھلا لگتا تھا۔ اور کسی نے بتایا کہ ابوالکلام یہی ہیں۔ یقین نہ آیا، مگر یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔

مدت کے بعد ملاقات مولانا شبلی کے مکان واقع گولہ گنج میں ہوئی، ان کے ہاں آئے ہوئے تھے، اور میری حاضری اکثر مولانا شبلی کے ہاں ہونے لگی تھی۔ مولانا اس وقت گولہ گنج احاطہ فقیر محمد خاں کی ایک گلی میں رہتے تھے۔ دار العلوم سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر، مولانا نے تعارف کرایا۔ بے تکلفی سے انہیں صرف 'آزاد' کہہ کر پکارتے تھے، اور تعارف باقاعدہ ہو گیا۔ دار العلوم ندوہ کچھ دن بعد اپنی نئی اور مستقل عمارت میں گومتی پار اٹھ گیا۔ مولانا منتقل ہو کر نئے امین آباد پارک کے ایک پر فضا بالاخانہ غالباً ۵۱ پر آ گئے۔ اور اب جب ابوالکلام کا لکھنؤ آنا ہوتا تو یہیں ٹھہرتے۔

اب مراسلت بھی ان سے شروع ہو گئی تھی، اور بظاہر اچھے خوشگوار تعلقات، لیکن اندرونی حالات، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالباری ندوی اور دوسرے ندویوں سے جو معلوم ہوتے رہتے تھے، اور جہاں ان کی ذہانت، طباعی، حاضر دماغی اور قوت حافظہ کی مدح و داد میں ہوتے تھے، وہیں ان کی دینی و اخلاقی حالت کی طرف سے کچھ اطمینان بخش نہ تھے اور غضب یہ تھا کہ خود مولانا شبلی بھی ان روایتوں کی کھل کر تردید نہیں کرتے تھے۔ راوی یوں بھی فی الجملہ ثقہ و معتبر ہی تھے، اب گویا مہر تصدیق لگ گئی — اور اب دل میں وقعت عظمت پیدا ہونے کا سوال ہی باقی نہ رہا۔

اپریل ۱۹۱۲ء میں سید رشید رضا مصری لکھنؤ ندوے میں بہ حیثیت صدر مجلس کے آئے۔ ظاہر ہے کہ ان کا برجستہ خطبہ عربی میں تھا۔ مولانا ابوالکلام بھی سامعین میں تھے۔ اصل تقریر کے معاً بعد انھوں نے اس کا ترجمہ ایسا رواں اور فر فر کر دیا کہ اوروں کے ساتھ مولانا

شبلی کو بھی حیرت ہو گئی۔ جون ۱۹۱۳ء میں محض سیاحۃً کلکتے جانا ہوا۔ الہلال نکل رہا تھا۔ اور خوب زوروں پر۔ مولانا نے بہ اصرار اپنے ہاں اتارا، اور بڑے اخلاص سے مہمان نوازی کرتے رہے، مولانا سلیمان ندوی، اور مولانا عبداللہ عمادی اور دو ایک اور بزرگ الہلال کے اسٹاف میں تھے، ان سب کی ملاقات وحسنِ التفات نے قیام کلکتہ کو لطف و انبساط سے بھر دیا۔ مگر ساری گفتگوئیں، ادبی، علمی پہلوؤں سے رہتی تھیں۔ مذہب کا چرچا نہ دیکھا نہ سُنا، اور مجھ اُس وقت کے ملحد کو فضا اس سے بہتر اور کیا ملتی —— کچھ ہی روز بعد الہلال میں میری ایک نئی کتاب فلسفہ جذبات کے سلسلے میں ایک علمی اصطلاح سے متعلق الہلال کے ایک اختلافی نوٹ سے، ایک ادبی بحث چھڑ گئی۔ اور بالکل بلا وجہ اس میں تلخی پیدا ہو گئی۔ ملال دل میں پہلے سے موجود ہی تھا، اس گرما گرمی نے اُسے تیز سے تیز تر کر دیا۔ اور ایک مخلص (مولانا عبدالباری ندوی) نے اگر مجھے خاموش ہو جانے پر مجبور نہ کر دیا ہوتا، تو خدا معلوم نوبت کہاں سے کہاں تک پہنچ جاتی —— اللہ مجھے اور فریق مقابل دونوں کو اس کے لیے معاف فرمائے۔ زیادتی اب سوچتا ہوں اور سالہا سال ہوئے کہ سوچ چکا ہوں، میری ہی تھی۔ ۱۹۱۸ء میں جب میں حیدر آباد میں تھا، اور مولانا رانچی جیل میں، تو اس رنجش کی صفائی بھی مراسلت سے میں نے کر لی۔ اور مولانا نے بر وجہ اخلاق کریمانہ یہ لکھ دیا کہ کوئی کدورت یا رنجش میری طرف سے تو تھی ہی نہیں۔ اور اس کے بعد آخر تک تعلقات معتدل و متوازن رہے۔ خلافت کمیٹی کے سلسلے میں ملاقاتیں کثرت سے رہیں۔ پہلے کانپور اور پھر بار بار دہلی میں۔

اور لکھنؤ جب مولانا لیڈر ہونے کے بعد آئے اور اب مولانا شبلی کی وفات کے بعد لکھنؤ کے ایک بڑے ہوٹل (اس وقت تک سول اینڈ ملٹری۔ اور اب برلنگٹن) میں ٹھہرتے تھے۔ تو غریب خانے پر اگر بھی عزت افزائی فرماتے۔

مولانا کا مسلسل قیام لکھنؤ میں کل چھ مہینے کا رہا (۱۹۰۵ء میں) مگر اتنے دنوں کے قیام میں لکھنوی زبان کے اُن گوشوں پر بھی عبور حاصل کر لیا تھا، جو صرف سالہا سال کے قیام ہی سے حاصل ہو سکتے تھے۔ ایک باریک چیز پہلوئے ذم سے احتیاط ہے۔ اچھے اچھے اس

ہیں جھجکا کھا جاتے ہیں۔ مولانا نے اسے گرفت میں لے لیا تھا، اور لکھنؤ کے بعض استاد تک ان کے سامنے زبان کھولتے ہچکچاتے تھے۔ مرزا عزیز لکھنوی اہلِ زبان تھے۔ ان کا دیوان "گل کدہ" جب چھپا، تو مولانا نے اپنے تبصرے میں زبان کی بھی گرفتیں دو ایک کیں۔

مولانا نے علوم عربی اسلامی کی تحصیل و تکمیل باقاعدہ کی ہو یا نہ کی ہو، بہر حال ان کی نظر کہنا چاہیے کہ سارے ہی علوم دینی پر وسیع و محیط تھی، اور دماغ مجتہدانہ لے کر آئے تھے۔ آخر عمر میں اخلاقی حیثیت سے بڑے پاکیزہ ہو گئے تھے اور عمر میں پختگی اور سنجیدگی آجانے سے شوخی و ظرافت پر قابو حاصل ہو گیا تھا۔ دوسرے کا کام نکال دینے میں ہر وقت مستعد و آمادہ رہتے تھے۔ بڑی بات یہ کہ ہندی سرکار، اور ہندو اہلِ حکومت سے اتنا گہرا اور ہمہ وقتی تعلق رکھنے کے باوجود وہ اکثریت سے مرعوب ذرا نہیں ہوئے، اور کسی موقع پر بھی اپنے کو مسلمان کہتے نہ شرمائے —— لغزشیں اور کمزوریاں کس میں نہیں ہوتیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی لغزشوں سے درگزر فرمائے۔

جواہر لال تو ان کی سوجھ بوجھ اور عقلِ سیاسی کے بھی بہت قائل تھے۔

حسنِ تقریر میں بے مثل تھے، پہلے تقریر اور زیادہ جوشیلی ہوتی تھی، اور بعض لفظ اور فقرے نا ملائم بھی زبان سے نکل جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ اس پر انہوں نے قابو حاصل کر لیا۔ اور تقریر بڑی صاف، شستہ، پر مغز، مدلل و مصالحانہ ہونے لگی تھی۔ اردو زبان کے وہ ادیب ہی نہیں، ایک صاحب طرز انشا پرداز تھے، اور جو رنگِ انشا ان کا تھا۔ اس میں کوئی ان کا شریک و سہیم نہ ہو سکا۔ بڑا ہی ظلم ان لوگوں نے کیا ہے، جنہوں نے اردو زبان و ادب کی تاریخیں لکھی ہیں اور مولانا کو برابر نظر انداز کیا ہے۔ یہ ظلم مولانا اور اردو زبان پر تو ہے ہی، خود اپنے اوپر بھی ظلم ان کے لکھنے والوں نے کیا ہے۔ پہلے تحریریں عربیت آمیز اور ثقیل ہوتی تھیں، آخر کی تحریریں بڑی سلیس اور عام فہم اردو میں ہونے لگی تھیں —— جب مولانا کی یاد آتی ہے، بہت ہی خوشگوار یادوں کا جھرمٹ اپنے ساتھ لے آتی ہے۔ اللہ مغفرت فرمائے۔ حشر میں ان کے اور مولانا سلیمان ندوی اور مولانا محمد علی کے درمیان جتنا خفگیوں کو دور کر دے۔ ونزعنا ما فی صدورھم من غل۔

مولانا آزاد کی سیرت کا ایک خاص پہلو

مولانا ابوالکلام کی ایک یاد

مولانا ابوالکلام مرحوم کی ترجمان القرآن پڑھنے والوں کو یاد ہوگا کہ سورۃ الکہف میں جہاں ذوالقرنین کا ذکر ہے، مولانا نے اس کا مصداق فارس (میڈیا) کے تاریخی شہنشاہ خورس یا کسرائے اوّل کو قرار دیا تھا۔ اور اس کے بسط وتشریح میں ایک فوٹو بھی ایک سنگین مجسمہ کا لے کر شاہ مذکور کا لگا دیا تھا۔ قدیم طرز کے علماء تفسیر قرآن میں انسانی فوٹو (خواہ وہ جس مقصد سے بھی ہو) دیکھ کر نہایت برہم ہوئے۔ اور پنجاب پنڈی بہاء الدین کے ایک صاحب نے حضرت مولانا تھانویؒ سے اس کے متعلق استفتاء بھی کر دیا۔ مولانا نے چار دوسرے علماء کے تائیدی دستخطوں کے ساتھ۔ اس کا جواب بہت مفصل کئی صفحوں میں دیا۔ اور حدیث وفقہ کی روشنی میں اس عمل کو سرتاسر ناجائز بتایا۔ اور پھر اس فتویٰ کو ایک عنوان دے کر "تقدیس القرآن المنیر عن تدنیس التصاویر" کے نام سے ایک مستقل رسالہ کی صورت میں شائع کر دیا۔ یہ ذکر ۱۳۵۵ھ مطابق ۱۹۳۶ء کا ہے ــــ فتوے شائع ہونے کے بعد پھر کیا ہوا؟ یہی ہوا ہوگا کہ اُدھر سے بھی جواب نکلا ہوگا۔ تائید کرنے والے فریقین کے پیدا ہو گئے ہوں گے، اور ایک مستقل ہنگامہ مناظرہ کا قائم ہو گیا ہوگا۔ اہل قلم میں اپنی ہار مانتا کون ہے اور کون فریق ایسا ہے۔ جو کچھ نہ کچھ دلائل اپنی موافقت میں نہ رکھتا ہو، پھر مولانا ابوالکلام جیسے زبردست وجید صاحبِ قلم کے لیے جواب دشوار ہی کیا تھا۔

لیکن نہیں، یہ کچھ بھی نہ ہوا۔ مولانا ابوالکلام نے یہی نہیں کیا، کہ آئندہ ایڈیشن سے تصویر کے نکال دینے کا اقرار کیا ہو، بلکہ ناشر کو لکھ دیا کہ خود اسی ایڈیشن کے باقی ماندہ نسخوں سے وہ تصویر نکال دی جائے! اور اس طرح ملّت کو ایک فتنہ میں پڑنے اور

مناقشہ و مجادلہ کی گرم بازاری سے، بال بال بچالیا، اس مسالمت، شرافتِ نفس، خود فنائی کی مثالیں، اس بیسویں صدی عیسوی ہیں، اگر معدوم نہیں، تو کالعدم تو ضرور ہی ہیں، حضرت تھانوی اس سے خود بھی متاثر کیسے نہ ہوتے۔ اور مستفتین کو جو خط لکھا۔ اس میں کس مسرت کے ساتھ یہ چھپے ہوئے الفاظ موجود ہیں :۔

"ماشاء اللہ تعالیٰ یہ آپ کے خلوص کا اثر اور ان کے سلامت قلب کی دلیل ہے، دونوں کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعائے مزید کرتا ہوں"

رفع شر کی یہ مثال اُمت کے لیے سبق آموز ہے۔ اور اس قابل ضرور ہے کہ مولانا ابوالکلام کی ہر سوانح عمری میں اسے عزت کے ساتھ جگہ دی جائے۔

(۲۱ مارچ ۱۹۶۱ء)

مولانا دریا بادی کے اس شذرے کو پڑھ کر ملک محمد الدین مالک ایڈیٹر رسالہ صوفی نے یہ مراسلہ لکھا۔

نالۂ صوفی

میرے متعلق ماہ مارچ ۱۹۶۱ء میں میرے نام کے اظہار کے بغیر مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ کے تفسیر سورۃ کہف میں تصویر چھاپنے اور اس پر حضرت حکیم الامتؒ کا میری درخواست پر مولانا آزاد مرحوم سے اس تصویر کی اشاعت کے متعلق ایک مضمون لکھنے، اور مولانا آزاد کا اس تصویر کو قرآن مجید سے نکال کر ضائع کرنے کا واقعہ قلمبند کر کے حضرت حکیم الامت کا اس رُوسیاہ اور حضرت مولانا ابوالکلام کے متعلق دعائے خیر فرمانے کا واقعہ لکھا ہے۔ اس کے لیے راقم آثم جناب کا از حد مشکور ہے، خدا کرے صدق جدید کے پڑھنے والوں نے اس گناہ گار کے حق میں دعائے خیر فرمائی ہو۔ یہ گناہ گار رسالہ صوفی کا مدیر تھا جو ۱۹۰۶ء میں جاری ہوا، اور ۱۹۴۸ء میں کاغذ نہ ملنے کی وجہ سے مجبوراً بند کرنا پڑا۔ بعد میں خواجہ ناظم الدین صاحب گورنر جنرل نے مجھے کراچی بلایا اور گورنمنٹ ہاؤس میں میری دعوت کی، اور صوفی کے بند کر دینے کی وجہ دریافت کی، چوں کہ

کاغذ نہ ملا تھا۔ میں نے صحیح طور پر عرض کر دی، انھوں نے فرمایا کہ اب جس قدر چاہو کاغذ
میں دیتا ہوں ایسا پرچہ بند نہیں ہونا چاہیے ہیں نے کہا کہ اب صوفی کے طرز کے
پرچے کامیاب نہیں ہوتے۔ اب تو شمع جیسے جریدے چل سکتے ہیں جس وقت صوفی
بند ہوا تھا اس کی اشاعت پندرہ ہزار تھی اور اسے صوفی نام کا ڈاک خانہ سب آفس
علیحدہ ملا ہوا تھا۔ اب تو لاکھ کوشش کی جاوے اس مذاق کے خریدار ہی نہیں مل
سکتے حالانکہ شمع لاکھ سے زیادہ کی تعداد میں چھپ رہا ہے۔

(ملک محمد الدین سابق رسالہ صوفی منڈی بہاءالدین، ضلع گجرات)
(پاکستان، ۲ر جون ۱۹۶۱ء)

ایک نامور معاصر شخصیت

سب سے نازک مسئلہ شخصیات کا ہوتا ہے۔ ممکن نہ تھا کہ معاصر شخصیات کا تذکرہ ہر جگہ مدح و تحسین ہی کے ساتھ ہو، یقیناً ناگواری، نکتہ چینی اور تلخی کے نمونے جا بجا نظر آئینگے۔ اور اپنے ہیرو یا مقتدا کا ذکر، ذکر خیر کے سوا، ہر پڑھنے والے پر گراں گزرنا بھی ایک امر طبعی ہے۔ لیکن اس کے لیے جامع کی ایک حد تک معذوری بھی ظاہر کی ہے ——— بہر حال ناظرین کرام اس کے لیے تیار رہیں کہ کہیں کہیں اُن کے جذبات کو دھچکا ضرور لگے گا۔ اور اس کے لیے جامع شروع ہی میں ان کے عفو و کرم کا خواستگار ہے۔

معاصروں میں ایک نامور شخصیت ضرور ایسی ہے، جس کے متعلق اپنا ذہن پہلے ہی صاف کر لیں تو بہتر ہے، مراد مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم و مغفور سے ہے۔ مرحوم کی ابتدائی زندگی جنھوں نے نہیں دیکھی ہے۔ وہ اُن کی محض تحریروں اور آخری حصۂ زندگی سے اس کا اندازہ نہیں کر سکتے، سید صاحب ان کے بے تکلف دوستوں میں تھے اور لکھنؤ اور کلکتہ دونوں میں انھیں بہت قریب سے دیکھ چکے تھے۔ انھیں اپنے علم و بصیرت کے مطابق ان میں بہت سی قابل اعتراض باتیں نظر آئیں۔ اس کا اظہار اس مجموعہ کے شروع ہی کے خطوں میں ہے۔ مولانا آزاد پر یہ بات ڈھکی چھپی نہ رہی۔ پوری طرح واضح ہو چکی تھی۔ انھوں نے سید صاحب سے صراحت کے ساتھ پوچھا کہ آخر آپ کی رنجش کے اسباب کیا کیا ہیں۔ یہ شرافت تو ان کی طرف سے ظاہر ہوئی، سید صاحب نے بھی بہ کمال شرافت اُن کی اس فرمایش کو قبول کر کے اپنے اعتراضات نمبروار لکھ بھیجے، مولانا آزاد نے اب اس سے بھی بڑھ کر اپنی شرافت کا ثبوت یوں دیا کہ سارا مکتوب سکون قلب کے ساتھ پڑھ کر اِس کا مفصل و مکمل جواب لکھا، اس میں پبلک زندگی اور نجی زندگی سے متعلق بعض اعتراضات کو من و عن تسلیم کر لیا، بعض کے لیے اعتراف کیا کہ کوشش اصلاح ہو رہی ہے، اور بعض کی صاف تردید کر کے سید صاحب

کو لکھا کہ اس بارے میں خود آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے، یہ مکتوب مولانا آزاد کے ہاتھ کا لکھا ہوا تقریباً پورے کا پورا (یعنی بجز بالکل آخری حصہ کے) دارالمصنفین کے ذخیرے میں مل گیا۔ اور اس کی نقل حاشیہ پر اپنے مناسب موقع پر درج ہے۔ اس سے کسی بھی صاحب فہم کے نزدیک مولانا مرحوم کے مرتبہ میں کمی انشاء اللہ نہ ہوگی۔ بلکہ ان کے ظرف کی عظمت میں اور اضافہ ہی ہوگا ـــــ یہ مکتوب شروع سنہ ۱۴ء کا ہے۔ سنہ ۱۸ء سے کہنا چاہیے کہ مولانا مرحوم کی زندگی میں خود ایک انقلاب عظیم ہو گیا، اور اصلاح کا پہلو کہیں زیادہ روشن ہو گیا۔ اس لیے اس دَور سے قبل کی سرگزشت پر خط تنسیخ ہی پھرا ہوا سمجھیے، خود سید صاحب بھی اخیر زمانہ میں مولانا کی طرف سے بڑی حد تک صاف ہو گئے تھے، بلکہ درمیان میں تو ایک دَور خاص لطف و محبت کا بھی آگیا تھا ـــــ ان خطوط کے جامع کو جو اختلافات مدیر الہلال سے تھے، وہ سنہ ۱۷ء سنہ ۱۵ء تک کہنا چاہیے کہ ختم ہی ہو چکے، اور اس کے بعد سے مرحوم سے مجالست و رفاقت کی سعادت خلافت کمیٹی وغیرہ کے سلسلے میں برسوں حاصل رہی۔

مولانا کی ملک گیر شہرت و شخصیت کے پیش نظر یہ تصریحات ضروری تھیں۔

(دیباچہ مکتوباتِ سلیمانی، لکھنؤ ۱۹۶۳ء)

مُراسلات

مولانا ابوالکلام کی دینی زندگی

آزاد نمبر میں ایک فروگزاشت :

آج کل (دہلی)، کا مشہور آزاد نمبر ہمارے بھی دیکھنے میں آیا۔ واقعی اس کی ادبی وسوانحی حیثیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اتنے سب مضامین پڑھ جائیے۔ آپ کو مولانا کی زندگی کے ہر پہلو سے واقفیت ہوگی حتیٰ کہ بزمانہ قید فرنگ ایک سحر سے اٹھنا اور چائے کا بذات خود اہتمام کرنا وغیرہ، مولانا کی چائے ویسے مشہور عام بھی ہے مگر کسی مضمون سے اس بات کا پتہ نہیں چلتا کہ اتنا بڑا علامۃ الدہر صبح وشام کی پانچ نمازوں میں سے کتنے وقت نماز پڑھتا تھا اور کیا اہتمام کرتا تھا۔ مگر کسی مضمون سے مولانا کی عملی مذہبی زندگی پر روشنی نہیں پڑتی - یہ یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ اتنا بڑا عالم سرے سے نماز روزہ رکھتا اور پڑھتا ہی نہ ہو، اور اس کے صبح کے اوقات تلاوت قرآن سے یکسر عاری ہوں۔ اگر ایسا نہیں ہے اور خدا نہ کرے کہ ایسا ہو جہاں موصوف کی زندگی کے معمولی سے معمولی واقعہ لکھا گیا ہے ان مذہبی معاملات کو نظر انداز کرنا قرین انصاف نظر نہیں آتا۔ اس پہلو کو اجاگر کرنے سے نہ تو مولانا کی قومیت متاثر ہو سکتی ہے اور نہ مضمون نگار حضرات پر کوئی فرد جرم عاید ہو سکتا ہے اگر اس پر کسی بھی مکتب خیال سے روشنی ڈالی جائے تو ایک بڑی فروگزاشت کی تلافی ہو جائے گی۔

آپ کا خادم

محمد امجد علی صدیقی آر، اف، او، ڈاک خانہ ملکا پور۔

ضلع کولھاپور

صدق ۔ مزید حیرت اس لیے کہ اس آزاد نمبر میں لکھنے والے مذہبی لوگ بھی ہیں ۔ مثلاً مولانا

سعید احمد اکبر آبادی، یا مہر صاحب لاہوری، کاش کوئی صاحب خصوصاً جمعیۃ العلماء سے تعلق رکھنے والے اپنی ذمہ داری پر، اس خلا کو پُر کردیں۔

(۱۶ر اکتوبر ۱۹۵۹ء)

مولانا ابوالکلام کی مذہبی زندگی:

(از مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی۔ صدر شعبۂ دینیات۔ علی گڑھ)

"سیرت النبی قرآن مجید کی روشنی میں" بڑا عمدہ مقالہ نکل رہا ہے اللہ کی شان ہے روا روی اور جلدی میں بھی اس قدر مفید اور جامع مقالہ آپ کے قلم سے نکل گیا۔ ذَالِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ۔

صدق مورخہ ۱۶ر اکتوبر ملا۔ اس کے صفحہ ۲ پر آزاد نمبر میں ایک فروگزاشت کے عنوان سے جو مراسلہ چھپا ہے اس پر آپ نے جو نوٹ لکھا ہے، چونکہ اس میں اس خاکسار کا بھی نام ہے اس لیے عرض یہ ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کی پرائیویٹ زندگی حد درجہ پُر اسرار تھی وہ ملاقات کے لیے ڈرائنگ روم میں آجاتے تھے ورنہ اپنے کمرہ میں بند رہتے تھے جہاں بڑے سے بڑا ان کا دوست بھی نہیں جاسکتا تھا۔ بعض معتبر راویوں سے معلوم ہوا ہے کہ مولانا اپنے کمرہ میں زیادہ تر وقت مطالعہ میں صرف کرتے تھے، قرآن مجید سے ان کو بڑا شغف تھا۔ وقت بے وقت اس کو اٹھا لیا اور جھوم جھوم کر پڑھنا شروع کر دیا۔ بسا اوقات ایک ہی آیت کو بار بار پڑھتے اور ہر مرتبہ آواز کے ساتھ ان کی وضع نشست بدل جاتی تھی۔ مولانا اپنے اور ذاتی معاملات میں جو اخفا سے کام لیتے تھے وہ تو لیتے ہی تھے۔ عبادت کے معاملہ میں خصوصاً بہت زیادہ اخفا کرتے تھے۔ ان کی اس طبیعت کی وجہ سے کسی کو اس بارہ میں خود ان سے کچھ دریافت کرنے کی ہمت نہیں ہوسکتی تھی۔ بہر حال ۳۶ء میں جب میں پہلی مرتبہ چند روز کے لیے کلکتہ گیا تھا۔ تو ان دنوں میں مولانا مفتی عتیق الرحمان صاحب عثمانی کی معیت میں دو تین بار مولانا کی خدمت میں بھی حاضری کا موقع ملا تھا اس وقت میں نے دیکھا کہ بات چیت کرتے کرتے اگر مغرب کی نماز کا وقت ہو گیا ہے مولانا نے نوکر کو آواز دی اس نے جانماز لاکر بچھا دی اور مولانا جس حالت میں

بیٹھتے تھے، اسی حالت میں کھڑے ہو کر نماز میں شریک ہو گئے۔ یعنی وضو نہیں کرتے تھے یہ گویا اس کی علامت تھی کہ عصر کی نماز پڑھے ہوئے ہیں اور باوضو ہیں۔ ان نمازوں میں وہ ہمیشہ مولانا مفتی عتیق الرحمان صاحب کو امام بناتے تھے کیونکہ مولانا مفتی صاحب موصوف کے حسنِ قرأت وصوت کے بڑے مداح تھے اور ان کی صحت مخارج کی بڑی تعریف کرتے تھے۔ فرض نماز کے بعد میں نے دیکھا ہے دو رکعت سنت کمال خشوع وخضوع سے پڑھتے اور تقریباً دس بارہ منٹ میں انھیں ختم کرتے تھے، اس کے بعد صوفہ پر آنکھ بند کر کے بیٹھ جاتے تھے جیسے کوئی مراقبہ کر رہا ہو، دس پندرہ منٹ کے بعد آنکھ کھولتے اور پھر گفتگو شروع کر دیتے تھے، مگر یہ گفتگو ہلکی اور مدہم آواز میں ہوتی تھی۔

مولانا اگر سفر میں ہوتے یا کسی میٹنگ میں شریک ہوتے تھے تو ایسے موقع پر جمع بین الصلوٰتین کرتے تھے، ایک مرتبہ اس پر گفتگو ہوئی تو فرمایا امام بخاری تو بلا کسی وجہ کے بھی جمع بین الصلوٰتین کو جائز قرار دیتے ہیں۔ میں تو صرف عند الضرورت ہی اس پر عمل کرتا ہوں۔

اس سلسلہ میں یہ واقعہ بھی آپ کی دلچسپی کا سبب ہو گا کہ پانچ چھ برس کی بات ہے ایک دن شام کو مولانا نے ایک مشہور منکر خدا شاعر جو مولانا کے یہاں بے تکلف آمد و رفت رکھتا تھا، اس سے فرمایا کہ ..... صاحب! میں چاہتا ہوں کہ خدا کے وجود پر ایک مرتبہ میں کھل کر بات چیت کر لوں۔ پھر چاہے آپ مانیں یا نہ مانیں مگر میں اپنا فرض ادا کر دوں گا۔ چنانچہ دوسرے دن صبح کے نو بجے کا وقت مقرر ہوا، یہ شاعر اپنے دو تین دوستوں کے ساتھ مولانا کی کوٹھی پر پہنچ گیا۔ جمعیۃ علماء کے بعض حضرات کو اس کا علم ہوا تو وہ بھی پہنچ گئے۔ یہ رمضان کا مہینہ تھا اور سخت گرمی پڑ رہی تھی، مولانا روزہ سے تھے مگر بایں ہمہ قاضی سجاد حسین صاحب صدر مدرس مدرسہ عالیہ فتحپوری دہلی جو خود اس مجلس میں شریک تھے، ان کا بیان ہے، کہ مولانا نے دو گھنٹہ تک وجود باری پر اس قدر فاضلانہ تقریر کی ہے کہ سب لوگ دم بخود تھے۔ دلائل سب کے سب عقلی اور فلسفیانہ تھے اور روانی اور فصاحت وبلاغت کا تو کہنا ہی کیا ہے، قاضی صاحب موصوف، جو خود جید عالم ہیں فرماتے تھے کہ مولانا کے تبحر علمی کا صحیح اندازہ اسی وقت ہوا۔ اور پتہ چلا کہ ان کا مستحضر علم بھی کس قدر عمیق ہے۔

صدق :۔ مکتوب گرامی کا آخری جزو ذرا بھی مستبعد نہیں اور بہت آسانی سے قابل یقین ہے۔ مرحوم مولانا کی خوش تقریری میں کسے شبہ ہو سکتا ہے، یہ دوسرے مسئلہ کی طرح وہ وجود باری پر بھی یقیناً بہت اچھی تقریر کرتے تھے اور ضرور انھوں نے کی ہوگی۔ باقی ذاتی عملی زندگی سے متعلق جو روشنی اس مکتوب میں ڈالی گئی ہے۔ وہ بے شک بہتوں کو نئی معلوم ہوگی۔ ایک مسلمان پر سے جو بھی الزام دفع ہو سکیں یا ہلکے ہو سکیں اس سے بڑھ کر خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔

(۱۱ دسمبر ۱۹۵۹ء)

مولانا ابوالکلام کی دینی زندگی :

ذیل کا مکتوب ایک نجی خط جامعہ کے مشہور فرزند عبدالملک مراد آبادی کا لکھا ہوا ہے۔ جسے مکتوب نگار نے صدق کے لیے بھیج دیا ہے۔

مولانا آزاد رحمہ اللہ کے دینی پہلو پر مولانا سعید احمد اکبر آبادی کا ایک نوٹ دیکھ کر ارادہ ہوا کہ آپ کو اس بارے میں کچھ لکھوں۔ جاکرتا (انڈونیشیا) میں پاکستانی سفارت خانہ میں ایک صاحب ملازم تھے ان کے والد مرحوم (غالباً چودھری نذیر احمد) کے مولانا سے گہرے تعلقات تھے، یہ ایک دفعہ دہلی گئے تو مولانا نے اپنے پاس ٹھہرایا وہ فرماتے تھے کہ میں نے مولانا کو کئی بار دیکھا، رات کو سجدہ میں روتے ہوئے اور بہت روتے ہوئے، روتے تھے اور مسلمانوں کے لیے دعا کرتے تھے۔ ہمارے یہ دوست کٹر پاکستانی ہیں مگر اس معاملہ میں مولانا سے بہت متاثر تھے۔ باقی ہمارے ابا جان مدظلہ، جو سال بھر تک حضرت مولانا کے گھر میں رہے اور اس طرح کہ گویا عائلہ کے ایک فرد ہیں۔ اس بارے میں کوئی خاص بات نہیں فرماتے۔ استادی ملک نصر اللہ خاں صاحب عزیز جیل میں مولانا کے ساتھ رہے، ایک واقعہ اسی زمانہ میں سنایا تھا کہ جس کا مفہوم یہ تھا کہ آدمی چاہے باقاعدہ متواتر نماز نہ پڑھے مگر جب پڑھے تو پھر دل لگا کر پڑھے۔'' ہمارے پاس جامعہ میں ۲۹ئہ سے ۴۵ئہ تک صرف دو ہی مرتبہ تشریف لائے ہیں پہلی دفعہ نماز خود ہی پڑھائی تھی۔ مغرب کا وقت تھا، پہلی رکعت میں والتین اور دوسری میں الماعون بعض لوگوں نے بعد میں ماعون کے معنی کے بارے میں سوال بھی کیا تھا۔

دوسری بار یا تو نماز سے پہلے تشریف لے گئے تھے یا سب کے ساتھ پڑھی تھی۔ میں جن اوقات میں دہلی میں حاضر خدمت ہوتا رہا وہ نماز کے اوقات نہ تھے، ایک دن صبح ناشتے کے بعد پہنچا تو باہر مجلس میں مولانا محی الدین قصوری مولانا کے مہمان تھے۔ مولانا اندر کمرہ میں تھے اطلاع پاکر تشریف لائے، قصوری صاحب سے معلوم ہوا کہ اندر ترنم کے ساتھ بال جبریل پڑھ رہے تھے۔ مگر جب باہر آئے ہیں تو ایسے تھے کہ گویا ان چیزوں سے کوئی واسطہ ہی نہیں۔ نماز کے بارے میں ایک شخص سے متاثر ہوا وہ سر اکبر حیدری ہے۔ اپنی وزارت عظمی کے زمانہ میں جامعہ آئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کمروں اور درسگاہوں کا معائنہ کرا رہے تھے کہ حیدری صاحب ایک کمرہ میں جس میں ڈیکس اور میزیں وغیرہ صفائی کے سلسلہ میں بھر دی گئی تھیں از خود گھس گئے۔ ڈاکٹر صاحب گھبرا گئے کیا چاہتے ہیں مگر جب انہوں نے قبلہ رخ ہو کپڑا بچھایا تو معلوم ہوا کہ نماز کے لیے کسی تنہا جگہ کی تلاش تھی۔ یہ عصر مغرب کے درمیان کا وقت تھا۔ ظاہر ہے عصر کی نماز ہو گی۔

صدق۔ کلمہ گو کی دینی حالت کے حق میں شہادت تو ضعیف بھی کافی ہوتی ہے۔ چہ جائیکہ جب شہادت کا درجہ بلند ہو، اور کلمہ گو کی شخصیت بھی معمولی نہیں۔ اس درجہ ممتاز واقع ہو۔ اب کوئی اور صاحب اس موضوع پر زحمت تحریر نہ اٹھائیں۔

(۲۰ رجنوری ۱۹۶۱ء)

مولانا ابوالکلام اور نماز :

افتخار فریدی صاحب کا مکتوب مراد آباد سے :۔

" مولانا ابوالکلام مرحوم کی دینداری کے تذکرے کے سلسلے میں ایک بات جو میرے سامنے گزری عرض کیے دیتا ہوں۔ رام گڑھ کے اجلاس کانگرس کے صدر مولانا تھے۔ اجلاس عموماً بعد دوپہر شروع ہوتا تھا۔ دو دن مسلسل کی یہ بات دیکھنے میں آئی کہ مولانا عصر و مغرب کے اوقات میں سردار پٹیل کو کرسی صدارت پر بٹھا کر تشریف لے جاتے رہے، بلکہ ایک موقع پر کسی تجویز پر ووٹنگ بھی سردار پٹیل ہی نے کرائی۔ اس سے اندازہ یہی ہوتا ہے کہ مولانا نماز وقت پر پابندی سے ادا کرتے تھے "

(۱۱ مارچ ۱۹۶۰ء)

مولانا آزادؒ کے آخری لمحاتِ حیات

فیروز بخت کی آخری گھڑیاں :

معاصر الجمیعۃ کے کالموں سے حضرت مولانا لقاء اللہ صاحب عثمانی پانی پتی نے مشرقی پنجاب کے اوقاف کے سلسلہ میں ایک یادداشت پیش کرنے کے لیے حضرت مولانا ابوالکلام آزاد سے جن کو آج مدظلہ العالی کے بجائے رحمۃ اللہ علیہ کہنا پڑ رہا ہے وقت لیا تھا۔ اور اسی غرض سے مولانا دہلی تشریف لائے ہوئے تھے ملاقات ہوئی مگر اس حالت میں کہ حضرت مولانا آزاد سکرات میں تھے، اور مولانا عثمانی یسٰین شریف پڑھ رہے تھے"۔

مولانا لقاء اللہ پانی پتی جیسے متقی دینداز کا عین نزع کے وقت آ پہنچنا۔ ایسی خبر نہیں کہ اسے محض اتفاقات زمانہ کے تحت درج کیا جائے، مرحوم کی یہ عین فیروز بختی تھی اور بالفرض مرحوم کی مغفوریت کی کوئی اور دلیل نہ ہوتی، تو انشاء اللہ یہی ایک دلیل کافی ہو جاتی مولانا عثمانی کے ایمانی درجہ و مرتبہ کے لوگ اُمت میں بس ڈھونڈھنے ہی سے مل سکتے ہیں ــــ مولانا مرحوم کا تاریخی نام یاد کر لیجیے کہ "فیروز بخت" تھا۔

(۱۷ مارچ ۱۹۵۸ء)

(۲)

مولانا دریابادی نے اپنے "سفرِ دکن" (۶) میں ڈاکٹر عبداللطیف سے اپنی ملاقات کی روداد کے ضمن میں حضرت مولانا آزاد کے آخری لحاتِ حیات کے بارے میں تحریر فرمایا ہے۔

ڈاکٹر عبداللطیف کے تعلقات مولانا ابوالکلام سے خصوصی تھے۔ ان کی ایک آدھ کتاب کو انگریزی کے قالب میں یہ لائے ہیں۔ ان کے زمانۂ علالتِ وفات ہیں، یہ وہیں، انھیں کی کوٹھی پر مقیم تھے، انھیں کے بیان سے معلوم ہوا کہ مرحوم جب سے غش کھا کر گرے، پھر ہوش نہ آیا اور نہ کچھ بول ہی سکے۔ صرف ایک بار وقتِ وفات سے چند گھنٹے قبل، ذرا سے

آثارِ ہوش آنے کے معلوم ہوئے، ڈاکٹر تدبیروں سے سخت کرب واذیت میں تھے، ہونٹ ہلے اور آواز صرف اتنی سنائی دی، کہ

چھوڑ دو، بس خدا پر چھوڑ دو!

اور بس پھر کوئی آواز اس عالم آب وگل میں نہ نکل سکی۔ مبارک اور خوش قسمت ہے وہ مسلمان جس کی زبان کا آخری کلمہ خدا کا نام ہو۔ مضطرب کی آخری پکار چارہ سازِ حقیقی کے نام کی۔

سفر دکن (۶) صدق جدید، لکھنؤ
۷ر فروری ۱۹۶۴ء، ص ۶

مولانا آزاد اور الندوہ کی نائب ایڈیٹری

مولانا ابوالکلام کے دو قدیم خط

مولانا دریابادی نے یہ سطریں مولانا عبدالباری ندوی کے نام مولانا آزاد کے خطوط پر نوٹ میں تحریر کی تھیں، یہ خط صدق جدید کی اشاعت ۲۴ مئی ۱۹۶۳ء میں شائع ہوئے تھے جو بعد میں "مکاتیب ابوالکلام آزاد" مرتبہ ابوسلمان شاہجہان پوری میں شامل کر لیے گئے۔

مولانا ابوالکلام کا قیام اپنے ابتدائی زمانہ میں کوئی دو برس جم کر مولانا شبلی کے ساتھ ندوہ میں رہا۔ الندوہ میں مضمون نگاری انھوں نے اسی زمانہ میں کی، اور اس وقت یہ ایک بڑی امتیازی چیز تھی۔ بلکہ الندوہ کا ایک نمبر تو کہنا چاہیے کہ انھیں کا مرتب کیا ہوا ہے، گو ضابطہ سے اس کے نائب مدیر مولانا عبدالسلام اور سید سلیمان ہی رہے! اور وہ بھی کئی سال بعد کو، اس مسلسل قیام کے بعد مولانا لکھنؤ سے چلے گئے، لیکن اس کے دو چار سال بعد سے اُن کا سفر لکھنؤ اکثر ہونے لگا، اور قیام بھی شروع شروع مولانا شبلی ہی کے ہاں ہوتا رہا۔ اس طرح ندوہ اور ندوہ والوں سے ربط کے موقع بڑے طویل عرصہ تک حاصل رہے۔

اسی دور کے ایک طالب علم ضلع بارہ بنکی کے مولوی عبدالباری تھے، جو آج ماشاء اللہ اشرفیات پر متعدد کتابوں کے مصنف اور حضرت تھانوی کے مسترشد و خلیفہ مولانا شاہ عبدالباری ندوی ہیں، مولانا آزاد کے ان کے تعلقات ایک حد تک بے تکلفی کے اسی زمانہ میں قائم ہو گئے تھے، چنانچہ مولانا کے دو مختصر خط جو بچے کھچے ان کے پاس پڑے رہ گئے تھے، ان سے مانگ کر درج ذیل کیے جاتے ہیں۔

یہ موٹی، لیکن بھولی ہوئی حقیقت ذہن میں تازہ کر لیجیے کہ عمر کے مختلف دور ہر شخص پر کیا کیا اور کیسے کیسے گزرتے رہتے ہیں۔

(۲۴ مئی ۱۹۶۳ء)

بعض ضروری تصریحات:

۲۴ رمئی کے صدق میں مولانا ابوالکلام آزاد کے دو مختصر غیر مطبوعہ خط شائع ہوئے تھے۔ ان کے شروع میں میرے قلم سے چند سطروں کی تمہید تھی، اس تمہید میں مولانا کے مستقل قیام لکھنؤ کی مدت کوئی دو سال لکھ دی گئی۔ اب ابوسلمان صاحب شاہجہان پوری[1] نے کراچی سے توجہ دلائی ہے کہ یہ مدت صحیح نہیں، ان کی تحقیق میں یہ مدت صرف چھ مہینے کی ہوتی ہے، اکتوبر ۱۹۰۵ء سے مارچ ۱۹۰۶ء تک، اس تصحیح کا شکریہ، ان کا اندازہ ضرور صحیح ہوگا۔ میری کوئی خاص تحقیق اس باب میں نہیں۔

اس کے آگے انھوں نے مولانا سید سلیمان ندوی کی "حیات شبلی" کے حوالے سے اور کئی باتیں درج کی ہیں۔ مثلاً یہ کہ الندوہ کی ادارت فلاں زمانے سے فلاں زمانے تک فلاں اور فلاں صاحب کے ہاتھ میں رہی، اور نام چار اور صاحبوں کے گنائے ہیں۔ یہ میرے علم میں صحیح نہیں۔ ادارت صرف دو صاحبوں (مولانا شبلی نعمانی اور مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی) کے ہاتھ میں شروع سے آخر تک رہی، کوئی تیسرے صاحب شریک ادارت نہیں رہے۔ ہاں الندوہ کے آخری دو برسوں میں یعنی ۱۹۱۰ء سے ۱۹۱۲ء تک بہ طور نائب مدیر پہلے کام مولانا عبدالسلام نے کیا اور پھر مولانا سید سلیمان ندوی نے، الندوہ کی مکمل فائل جن صاحب کے بھی پاس موجود ہو، پرچوں کے سرورق سے اس کی تصدیق کر لیں۔

(۵ رجولائی ۱۹۶۳ء)

ابوسلمان صاحب شاہجہانپوری (کراچی):

"صحافت، تاریخ اور اخلاق کے نام پر اپیل" کے باوجود افسوس ہے کہ آپ کے سنجیدہ مگر طویل مراسلہ کے لیے جگہ نہ نکل سکی[2]

---

[1] ابوسلمان صاحب کا وہ خط جو اس شذرے کی تحریر کا باعث ہوا تھا، مولانا دریابادی نے صدق جدید میں شائع کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ چنانچہ مدینہ، بجنور میں چھپوا دیا گیا تھا، یہاں یہ خط من وعن، جیسا کہ مدینہ میں چھپا تھا، درج کیا جا رہا ہے۔ [2] اس خط کی طرف اشارہ ہے، جو پچھلے شذرے کی تحریر کا باعث ہوا تھا، اگلے صفحات میں درج کر دیا گیا ہے۔

مولانا ابوالکلام کی ایڈیٹری اور سب ایڈیٹری سے متعلق جو کچھ اپنے معلومات تھے پیش کر دیے گئے۔ اب اگر کسی صاحب کا اطمینان ان سے نہیں ہوتا۔ تو ظاہر ہے کہ اس باب میں کوئی زبردستی تو کی نہیں جا سکتی۔ قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ۔

مولانا ندوی اور مولانا عمادی کی سب ایڈیٹری الہلال میں ہرگز زیر بحث نہیں۔ گفتگو صرف ان حضرات کی مقالہ نگاری کے باب میں ہے۔ عام مقالہ نگاروں کے نام اس میں چھپتے رہتے تھے۔ سب ایڈیٹروں کے نام کا اعلان اس میں نہیں ہوتا تھا، اور عام صحافتی دستور بھی یہی تھا۔ صرف الندوہ نے عام دستور سے کسی قدر ہٹ کر کے یہ بات کی تھی۔

صدق کی جو پہلی عبارت نقل ہوئی ہے اس میں بسلکدوشی سے کوئی اشارہ ایڈیٹری کی جانب نہ تھا۔ بلکہ محض کام کی جانب تھا، اور کام سے مراد مستقل مقالہ نگاری تھی۔

(۱۳ر ستمبر ۱۹۶۳ء)

چند غلط فہمیوں کا ازالہ

پھر چھیڑا حسن نے اپنا قصہ
بس آج کی شب بھی سو چکے ہم

برادر سعید اختر!

صدق جدید (لکھنؤ) ۲۴ر مئی ۱۹۶۳ء میں مولانا ابوالکلام آزاد کے دو خط مولانا عبدالباری ندوی صاحب مدظلہ، کے نام شائع ہوئے تھے۔ ابتدا میں مدیر صدق حضرت مولانا عبدالماجد صاحب مدظلہ، (دریابادی) کے قلم سے ایک نوٹ تھا۔ مجھے اس میں چند باتیں خلاف واقعہ نظر آئیں۔ اس سلسلے میں میں نے حضرت مولانا دریابادی مدظلہ، کی خدمت میں ایک عریضہ لکھا تھا۔ تاکہ ان خلاف واقعہ باتوں کی حقیقت واضح کر دی جائے، اگر یہ غلطیاں ہم جیسے طالب علموں کے قلم سے ہوں تو اتنا خطرہ نہیں ہوتا، ہماری باتوں کو کون قابلِ اعتنا سمجھتا ہے، لیکن اگر تسامحات کا تعلق کسی مستند اور قابل اعتماد قلم سے

ہو تو افسانہ کو حقیقت بنتے دیر نہیں لگتی۔ اس بارے میں اسوۂ حسنہ بھی میرے سامنے صاحب صدق، ہی کا تھا، ۱۹۶۱ء (جولائی) میں محترمہ سیدہ سلامت اللہ، کا ایک مقالہ بعنوان "مجتہد و مجاہد ابوالکلام آزاد" رسالہ جامعہ دہلی میں شائع ہوا تھا، مولانا موصوف کو اس میں بعض باتیں خلاف واقعہ نظر آئیں۔ چنانچہ آپ نے فوراً ایک مفصل مکتوب گرامی میں ایڈیٹر جامعہ، جناب مولوی عبداللطیف اعظمی صاحب کو اس جانب توجہ دلائی، مولانا نے تحریر فرمایا تھا :

"ان چیزوں کے یوں ہی چھپ جانے سے آپ کے پرچے کی ثقاہت پر حرف آتا ہے، اور تردید نہ کی جائے تو یہی چیزیں آگے چل کر تاریخ بن جائیں گی"
(رسالہ جامعہ دہلی اگست ۱۹۶۱ء ص ۵۵۷)

ٹھیک ٹھیک اسی جذبہ نے مجھے ایک عریضہ لکھنے پر مجبور کیا تھا، یہ عریضہ آپ بھی ملاحظہ فرمالیں۔

آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پاکستان

کراچی - ۱۶

باسمہ تعالیٰ

۱۰ / جون ۱۹۶۳ء

حضرت مولانا مدظلہ

صدق جدید ۲۴ / مئی ۱۹۶۳ء کے شمارہ میں مولانا آزاد مرحوم کے دو خط نظر سے گزرے بلاشبہ یہ خطوط تاریخی ادبی حیثیت کے حامل ہیں، ابتداء میں آپ نے ایک مفصل نوٹ تحریر فرمایا ہے، جس کے ابتدائی چند جملے یہ ہیں :

"مولانا ابوالکلام آزاد کا قیام اپنے ابتدائی زمانہ میں کوئی دو برس جم کر مولانا شبلی کے ساتھ ندوہ میں رہا۔ الندوہ میں مضمون نگاری انھوں نے اسی زمانہ میں کی، اس وقت یہ ایک بڑی امتیازی چیز تھی، بلکہ الندوہ کا ایک نمبر تو کہنا چاہیے کہ انھیں کا مرتب کیا ہوا ہے، گو ضابطہ سے اس کے نائب مدیر مولانا

عبدالسلام اور مولانا سید سلیمان ندوی ہی رہے۔"

مجھے اس سلسلے میں دو باتیں عرض کرنی ہیں، امید ہے کہ زحمتِ سماعت فرمائیں گے اور اگر معروضات صحت پر مبنی ہوں تو صدق کی کسی اشاعت میں شائع فرمادیں، تاکہ ایک مرحوم کے بارے میں ایک ممدوح محترم کا تسامح علم و تحقیق کے طالب علموں کے لیے کسی غلطی کا موجب نہ بن جائے۔

(۱) میرے ناقص علم کے مطابق مولانا آزاد کبھی بھی دو سال جم کر مولانا شبلی کے ساتھ ندوہ میں نہیں رہے۔

(۲) مولانا آزاد کی مضمون نگاری کے زمانہ میں حضرت مولانا عبدالسلام ندوی و حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رح "الندوہ" کے نائب مدیر بھی نہیں تھے، ان کی ادارت کا دور اس کے بعد کا زمانہ ہے۔

میرے علم کے مطابق واقعات کی ترتیب حسب ذیل ہے:

(۱) اگست ۱۹۰۴ء میں "الندوہ" کا پہلا نمبر ۳۲ صفحات کی ضخامت پر مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی اور مولانا شبلی کی ادارت میں شاہجہان پور سے شائع ہوا۔

(۲) جون ۱۹۰۵ء سے ستمبر ۱۹۰۵ء تک مولانا عبداللہ العمادی اس کے نائب مدیر رہے، پھر وہ وکیل امرتسر میں چلے گئے۔

(۳) اکتوبر ۱۹۰۵ء سے مارچ ۱۹۰۶ء تک مولانا ابوالکلام آزاد دہلوی "الندوہ" کے سب ایڈیٹر رہے، . . . . . آخر کار وہ بھی ۱۹۰۶ء میں وکیل امرتسر میں چلے گئے۔

(۴) ۱۹۰۶ء، مولانا سید سلیمان ندوی رح کی تعلیم کا آخری سال تھا، مولانا ابوالکلام آزاد کے امرتسر چلے جانے کے بعد مولانا شبلی نے "الندوہ" کا بوجھ حضرت سید صاحب رح کے کاندھوں پر رکھ دیا، جس کو وہ مارچ ۱۹۰۸ء تک انجام دیتے رہے۔

(۵) اس کے بعد پھر عمادی صاحب کے سپرد کیا گیا، لیکن جون اور جولائی ۱۹۰۸ء کے صرف دو نمبر ان کی ادارت میں نکلے۔

(۶) اگست ۱۹۰۸ء سے فروری ۱۹۱۰ء تک دوبارہ حضرت سید سلیمان ندوی رح

کے زیر ادارت نکلتا رہا۔

(۷) اس کے بعد یہ عزت حضرت مولانا عبد السلام ندوی کو حاصل ہوئی، جس کو انھوں نے مارچ ۱۹۱۰ء سے جولائی ۱۹۱۱ء تک بخوبی انجام دیا۔

(۸) اگست ۱۹۱۱ء سے تیسری بار اس کی ادارت حضرت سید صاحب رح کے سپرد ہوئی، جس کو انھوں نے مئی ۱۹۱۲ء تک پورا کیا اور اسی پر "الندوۃ" کا خاتمہ ہوا، جس کے ایڈیٹر مولانا شبلی نعمانی اور مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی تھے، یہ تمام تفصیلات حضرت علامہ سید سلیمان ندوی نور اللہ مرقدہ کی تصنیف "حیات شبلی" کے صفحہ ۴۴۰ تا ۴۴۶ سے ماخوذ ہیں، میرے علم کے مطابق مولانا آزاد، وسط ستمبر ۱۹۰۵ء میں لکھنؤ پہنچے تھے، بلکہ ٹھیک اس روز، جس روز حضرت علامہ شبلی رح کی اہلیہ کا انتقال ہوا تھا۔ اس طرح کسی صاحب نظر و کاوش کی جستجو تاریخ کا تعین بھی کر سکتی ہے۔ مارچ ۱۹۰۶ء میں مولانا آزاد رح لکھنؤ سے رخصت ہو گئے۔ یہ مدت تقریباً ۶ ماہ کی ہوتی ہے۔ اس سے زیادہ مسلسل اور مولانا شبلی کے ساتھ ندوہ میں قیام ثابت نہیں ہوتا، یہی ۶ ماہ ان کی مضمون نگاری اور مولانا شبلی کے ساتھ جم کر رہنے کا زمانہ ہے، بلکہ الندوہ کے نائب مدیر کی حیثیت سے قیام کیا تھا۔

اوپر کی دفعات سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ حضرت سید سلیمان ندوی کا زمانہ ادارت حضرت مولانا آزاد کے زمانہ مضمون نگاری سے بعد کی بات ہے اور مولانا عبد السلام ندوی نے تو اس وقت تک مضمون نگاری بھی شروع نہ کی تھی، چہ جائیکہ "الندوہ" کی ادارت! ان کا پہلا مضمون مسئلہ تناسخ پر مئی ۱۹۰۶ء میں شائع ہوا۔ آخر ۱۹۰۹ء میں تعلیم سے فارغ ہوئے، اور مارچ ۱۹۱۰ء میں نائب مدیر مقرر ہوئے۔ یہ زمانہ مولانا آزاد کے قیام لکھنؤ اور ان کی مضمون نگاری کا نہ تھا۔

خدا کرے مزاج سامی بخیر ہوں، والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

نیازمند، ابو سلمان شاہجہان پوری

حضرت مولانا دریابادی مدظلہ نے اس عریضہ کی اشاعت تو مناسب نہ خیال فرمائی، البتہ اس کا تذکرہ ۵ جولائی ۱۹۶۳ء کے صدق جدید (ص ۶) میں فرمایا ہے۔ مولانا موصوف نے

مولانا آزاد کے قیام لکھنؤ کی نسبت تو تسلیم کر لیا۔

"اس تصحیح کا شکریہ، ان کا اندازہ ضرور صحیح ہوگا، میری کوئی خاص تحقیق اس باب میں نہیں۔" لیکن "الندوہ" کی ادارت سے مولانا ابوالکلام آزاد کا تعلق ان کے نزدیک کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ فرماتے ہیں:

"انھوں نے (ابوسلمان الہندی نے) مولانا سید سلیمان ندوی کی حیات شبلی کے حوالہ سے اور کئی باتیں درج کی ہیں۔ مثلاً یہ کہ الندوہ کی ادارت فلاں زمانہ سے فلاں زمانہ تک فلاں اور فلاں صاحب کے ہاتھ میں رہی اور نام چار اور صاحبوں کے گنائے ہیں ـــــــــ یہ میرے علم میں صحیح نہیں۔ ادارت صرف دو صاحبوں (مولانا شبلی نعمانی اور مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی) کے ہاتھ میں شروع سے آخر تک رہی۔ کوئی تیسرے صاحب شریک ادارت نہیں رہے۔ البتہ الندوہ کے آخری دو برسوں میں، یعنی ۱۹۱۰ء سے ۱۹۱۲ء تک بطور نائب مدیر پہلے کام مولانا عبدالسلام نے کیا، اور پھر مولانا سید سلیمان ندوی نے۔ الندوہ کی مکمل فائل جن صاحب کے پاس بھی موجود ہو، پرچوں کے سرورق سے اس کی تصدیق کر لیں۔"

(صدق جدید لکھنؤ۔ ۵ جولائی ۱۹۶۳ء صـ۶)

میرا خیال ہے کہ حضرت مولانا دریابادی مدظلہٗ کو مولانا سید سلیمان ندوی کے بیان کو تسلیم کر لینا چاہیے۔ اس لیے کہ "الندوہ" کی "سب ایڈیٹری" کی بابت جو تفصیلات حضرت سید صاحب رح نے "حیات شبلی" میں دی ہیں وہ زیادہ مستند ہیں۔ یا پھر "حیات شبلی" اور اس کے مصنف "علامہ سید سلیمان ندوی رح" کے بارے میں تحریر فرمائیں کہ وہ کس درجہ کی تصنیف ہے، اور کس مرتبہ کا اس کا مصنف ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ معلومات تاریخ و ادب کے طالب علموں کے لیے بہت مفید ہوں گی۔

میرا خیال ہے کہ مولانا دریابادی مدظلہٗ نے یہ بات بطور اصول، تسلیم کر لی ہے کہ اگر کسی رسالہ کے سرورق پر ایڈیٹر کے نام کے ساتھ نائب ایڈیٹر کا نام درج نہ ہو تو اس

کی ادارت کو تسلیم نہیں کیا جاتا، اور اس طرح کسی رسالہ میں مضمون نگار کے نام کے بغیر تمام مضامین ایڈیٹر کے مانے جائیں گے۔ اور کسی ایسے شخص کا دعویٰ ادارت وملکیت مضمون تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ جس کا نام پرچے کے سرورق پر بحیثیت مدیر یا نائب مدیر، یا مضمون نگار کی حیثیت سے مضمون کے ساتھ درج نہ ہو؟

میں تو یہ نہیں کہہ سکتا کہ مولانا دریابادی مدظلہ حقائق کو نظر انداز کر کے ایک نئی تاریخ کی ترتیب کی کوشش فرما رہے ہیں، لیکن ہر شخص یہ بات محض اس بنیاد پر تسلیم نہیں کر سکتا کہ "صاحب صدق" کا بیان ہے۔

صرف ایک بات اور عرض کرنی ہے، مولانا فرماتے ہیں :۔

"الندوہ کے آخری دو برسوں میں یعنی ۱۹۱۰ء سے ۱۹۱۲ء تک بطور نائب مدیر پہلے کام مولانا عبدالسلام نے کیا، پھر مولانا سید سلیمان ندوی نے۔"

(صدق جدید ۵ رجولائی ۱۹۶۳ء)

اور ۲۴ رمئی کے صدق جدید میں فرمایا تھا :

"الندوہ میں مضمون نگاری انھوں نے (مولانا آزاد نے) اسی زمانہ میں کی اور اس وقت یہ ایک بڑی امتیازی چیز تھی، بلکہ الندوہ کا ایک نمبر تو کہنا چاہیے کہ انھیں کا مرتب کیا ہوا ہے۔ گو ضابطہ سے اس کے نائب مدیر مولانا عبدالسلام اور سید سلیمان ندوی ہی رہے۔"

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نمبر جسے مولانا آزاد کا مرتب کیا ہوا کہنا چاہیے وہ ۱۹۱۰-۱۲ء کا ہے، جب مولانا عبدالسلام اور مولانا سید سلیمان ندوی ناضابطہ الندوہ کے نائب ایڈیٹر تھے۔ میں ایک طالب علم ہوں۔ اس لیے کیا کہہ سکتا ہوں۔ البتہ مولانا موصوف سے گزارش ہے کہ اگر انھوں نے کتب خانہ ندوۃ العلماء کے ۱۹۰۵-۰۶ء کے "الندوہ" کے فائل واپس بھیج دیے ہوں تو منگوالیں اور تصحیح فرمالیں۔

مجھے حضرت مولانا سے ایک تھوڑی سی شکایت بھی ہے کہ جب آں محترم نے میرے کسی بیان ودعویٰ کی تردید فرمائی تھی تو اس دعوے کو نقل بھی کر دینا چاہیے تھا۔ اگر مولانا

کی اس تحریر کا مخاطب صرف مدعی ہوتا تو بیان و دعوی کے نقل کرنے کی ضرورت نہ تھی،
لیکن حقیقت یہ نہیں۔ مولانا کی تحریر کے مخاطب "قارئین صدق" ہیں۔ پھر کیا مولانا نے مدعی
کا "دعوی" بھی ان کو بتایا، جن کو انھوں نے اپنا فیصلہ سنایا ہے؟

برادرم! عریضہ طویل ہو گیا، لیکن یہ بہت ضروری تھا۔ اُمید ہے کہ آپ اسے مدینہ کی
کسی قریبی اشاعت میں درج فرما کر ممنون فرمائیں گے۔

خدا کرے بخیریت ہوں۔ والسلام علیکم

ابوسلمان شاہجہان پوری

(سہ روزہ مدینہ، بجنور۔ ۲۸ر جولائی ۱۹۶۳ء)

ابوسلمان شاہجہان پوری (کراچی)

اب جو فقرہ آپ نے لکھا ہے کہ "..... فلاں سـ ـہ میں ایک مختصر مدت تک عملاً
ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے" یہ بالکل صحیح ہے۔ مگر اس میں لفظ عملاً کو نمایاں کر
دینا بہتر ہو گا۔

(اپنے مراسلہ نگاروں سے، ۲۵ر اکتوبر ۶۳ء)

شذرات

مولانا دریابادی "سچی باتیں" کے عنوان سے صدق جدید میں علمی، ادبی، اخلاقی، معاشرتی، سیاسی ہر طرح کے واقعات و حوادث پر چھوٹے چھوٹے شذرات تحریر فرماتے تھے، یہ مدیر کے قلم سے صدق جدید کا خاص کالم ہوتا تھا! ہندوستان پاکستان کے متعدد اخبارات و رسائل اسے نقل کرتے تھے۔ ان شذرات میں اہمیت اُن کی رائے ہی کی نہیں، ان کے اسلوبِ نگارش اور طرز تنقید کی بھی ہوتی ہے۔ فاضل مدیر نے متعدد کالموں میں اپنے مخصوص تعلیمی و اصلاحی انداز اور طرز تنقید میں مولانا آزاد کے افکار، خدمات، خصائص سیرت پر روشنی ڈالی ہے۔ اس مقام پر مولانا دریابادی فاضل مدیر صدق جدید کے ایسے ہی شذرات کو مرتب کر دیا گیا ہے۔ بعض شذرات کسی موضوع تحت کے تحت بھی درج ہوئے ہیں۔

غنیمت ہے کہ یوپی کانگریس کے ایک ذمہ دار فرد (شری الگورائے شاستری، صدر یوپی کانگریس) نے مسلمانوں کی خدمات آزادی وطن کا اعتراف صاف لفظوں میں کیا، اور زندہ اکابر میں مولانا آزاد اور مولانا حسین احمد کے ساتھ ساتھ رئیس الاحرار مولانا محمد علی کی خدمات جلیلہ کا بھی اعتراف کیا۔

(۲۴ر اکتوبر ۱۹۵۲ء)

ایک تردید:

صدق عدد ۹ میں امام جماعت احمدیہ (ربوہ) کی اس تقریر کا ذکر آچکا ہے۔ جس میں معاصر "الفضل" کی یہ فضیلت بیان ہوئی تھی، کہ مولانا ابوالکلام نے جیل میں اخبار پڑھنے کے لیے صرف اسی کا انتخاب کیا تھا۔ اس کی واضح و کامل تردید میں مولانا کے پرائیویٹ سکریٹری محمد اجمل خاں صاحب کا جو مکتوب موصول ہوا ہے وہ حسب ذیل ہے:-

"یہ پڑھ کر میں نے مولانا سے حقیقت حال دریافت کی انھوں نے فرمایا کہ عمر بھر میں کبھی ایسے اخبار کا جس کا نام الفضل ہو پڑھنے والا نہیں رہا ہوں۔ اور یہ

واقعہ بھی سرے سے غلط ہے کہ جیل میں مجھے صرف ایک اخبار کے منگوانے کی اجازت دی گئی، جب میں رانچی میں قید تھا تو پانچ چھ انگریزی روزانہ اخبار میرے پاس آتے تھے، علی پور سنٹرل جیل کلکتہ میں گورنمنٹ کی طرف سے اسٹیٹسمین مجھے ملتا تھا۔ اور امرت بازار پتر کا اور سرونٹ میں منگاتا تھا۔ احمد نگر قلعہ میں ابتدا میں بندش رہی۔ اس کے بعد جب بندش دور ہوگئی تو جتنے اخبار ہم چاہتے تھے وہ برابر ہمارے پاس آتے تھے۔ علاوہ بریں جیل میں مطالعہ کے لیے ضرورت ہوتی ہے کہ روزانہ اخبارات کا مطالعہ کیا جائے۔ وہاں اُردو کے ایک ہفتہ وار یا ماہوار مذہبی پرچہ کے منگانے کا وہم وگمان بھی کسی کو نہیں ہو سکتا، اور وہ بھی قادیان کا" ..... افسوس ہے کہ ایک صاحب جو اپنے آپ کو اپنی جماعت کا امیر قرار دیتے ہیں۔ ایسی غلط اور بے پر کی بات اپنی تقریر میں کہتے ہیں"

بیشک ایک ذمہ دار شخصیت کی زبان سے ایسا غیر ذمہ دارانہ بیان نکلنا حیرت انگیز بھی ہے اور افسوسناک بھی۔

(۱۱ر فروری ۱۹۵۵ء)

ایک خوشگوار تردید:

صدق ۳۱ (۵ر جولائی ۵۷ء) میں حیدر آباد کی ایک خاتون کا مراسلہ اس مفہوم کا نکل چکا ہے کہ حلف وزارت مولانا ابوالکلام نے انگریزی میں اور پنڈت جواہر لال نے ہندی میں اٹھایا تھا۔ یہ خبر اگرچہ تھی تعجب انگیز لیکن بہرحال ان تعلیم یافتہ خاتون کی ذمہ داری پر شائع کر دی گئی، بڑی مسرت کی بات ہے کہ معاصر الجمعیۃ نے اس روایت کی پوری تردید کر دی ہے۔ اس کے الفاظ ہیں " واقعہ یہ ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے ہندی میں نہیں بلکہ انگریزی میں حلف اٹھایا اور مولانا ابوالکلام نے انگریزی میں نہیں بلکہ اُردو رسم الخط کے ساتھ ہندی آمیز اُردو میں حلف اٹھایا۔ مولانا نے اپنے قلم سے اُردو میں حلف کی عبارت لکھی اور اس کو پڑھ کر سنایا۔ مولانا کی یہ تحریر مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ممبر پارلیمنٹ کے

پاس محفوظ ہے۔ جسے ہر شخص دیکھ سکتا ہے۔"

اس سے بڑھ کر مسرت انگیز خبر اور کیا ہو سکتی ہے۔ لیکن خود دہلی کے اُردو معاصرین کو بھی چاہیے تھا کہ خبر کے اس جزو کو نمایاں کر کے شائع کرتے۔ نیوز ایجنسیوں کا جو حال ہے، ظاہر ہے ان سے اس کی توقع ہی کب تھی۔

(۱۲ر جولائی ۱۹۵۷ء)

ایک نادر تجویز :

کلکتہ کے پروفیسر ہیرن مکرجی ایم پی کی تقریر لوک سبھا میں مولانا ابوالکلام کی یادگار کے مسئلہ پر :۔

"مولانا آزاد کی یاد میں یہ مناسب ہوگا کہ وزارت تعلیم یونیورسٹیوں اور خاص طور پہ کلکتہ شہر میں جس کے ساتھ مولانا کا گہرا تعلق تھا سنسکرت کلاسیکل اسٹڈی اور اسلامی تہذیب و تمدن کی تعلیم کا مناسب انتظام کرے"!

بہت ہی خوب! مولانا کی یاد میں سنسکرت کلاسیکل اسٹڈیز کا ادارہ کھولنے کا مشورہ بہت خوب! شیخ و برہمن کے اتحاد کا یہ مرقع بھی کیا خوب ہے! ـــ کوئی پنڈت جی مہاراج دنیا سے گزر جائیں، تو ان کی یادگار، تو کسی سنسکرت ادارہ کی شکل میں قائم ہونا ظاہر ہی ہے اور کوئی مولانا وفات پائیں، تو ان کی بھی رواداری کی یادبجز اس طرح کے اور کیونکر منا کر جنتا اپنے دل کو تسکین دے! گویا ہر مرحوم مولانا سے کام ایک زندہ ڈاکٹر سمپورنانند کا لیا جانے لگے!

(۴ر دسمبر اپریل ۱۹۵۸ء)

تسلی بخش توضیح :

"انڈیا ونس فریڈم" کے محفوظ صفحات کے بارے میں اسٹیٹسمین کے وقائع نگار خصوصی کی پروفیسر ہمایوں کبیر سے گفتگو اور وضاحت کے بارے میں:"

ایک بڑی کھٹک مولانا مرحوم کے بعض نیازمندوں کو تھی کہ کہیں اس حصے میں ایسے مذہبی عقیدے نہ ہوں جن کی اشاعت نامناسب سمجھی گئی، ہمایوں کبیر صاحب کے بیان کے بین السطور سے بحمداللہ

اس طرف سے اطمینان ہوگیا اور معلوم ہوا کہ ان اوراق میں کچھ ایسی سیاسی رائیں اور خیالات ہیں، جن کی اشاعت سرِدست قرینِ مصلحت نہیں۔

(۲۰ رجون ۱۹۵۸ء)

ایک مخلصانہ تنقید:

اُردو کے باوقعت علمی و دینی ماہنامہ برہان (دہلی) کے ایک نوٹ سے، بہ سلسلۂ یادگار علمی مولانا ابوالکلام مرحوم:-

"مولانا ابوالکلام خواہ اور جو کچھ بھی ہوں۔ اصلاً ایک عالم دین ہی تھے ..... اسی بنا پر مولانا کا سرمایۂ تحریر زیادہ تر مذہبی مضامین پر ہی مشتمل ہے، پھر چونکہ مولانا نے مختلف وجوہ و اسباب سے یہ مضامین زیادہ تر اپنے حافظے پر اعتماد کر کے لکھے ہیں۔ اس لیے ان میں حوالہ یا تعبیر کی بعض غلطیاں بھی ہوگئی ہیں۔ چنانچہ کتاب ترجمان القرآن جو مولانا کی تصانیف میں ایک شاہ کار کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ بھی غلطیوں سے خالی نہیں اور بعض غلطیاں تو علمی اعتبار سے بڑی فاحش ہیں۔ مثلاً سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں مالک یوم الدین کے ماتحت مولانا نے عربی کا یہ شعر نقل کیا ہے ؎

ستعلم لیلیٰ ای دین تداینت ۔۔۔ وای غریم فی التقاضی غریمہا

اس شعر میں مولانا نے دین کے لفظ کو بکسر الدال پڑھا ہے۔ حالانکہ صحیح یہ فتح الدال ہے۔ اور قرض کے معنی میں ہے۔ چنانچہ تداینت، غریم، تقاضی ان سب لفظوں سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ اس بنا پر نہایت ضروری ہے کہ جہاں کہیں اس طرح کی غلطی ہو اس کی تصحیح کر دی جائے، یا کم از کم فٹ نوٹ میں اس کی طرف اشارہ کر دیا جائے، اس مقصد کے لیے ضروری تھا کہ کمیٹی میں مولانا حفظ الرحمٰن یا مولانا عتیق الرحمٰن جیسے ایک دو عالموں کو بھی شامل کیا جاتا۔ تاکہ مولانا کے مذہبی مضامین کی ترتیب و تہذیب اور ان کا اِڈٹنگ خاطر خواہ طریقہ پر ہوتا۔"

ایک بڑی مصیبت یہ ہے کہ ملت کے جہاں کسی بڑے شخص کی آنکھ بند ہوئی۔ بس اسے بے تحاشا "ہیرو" بنا لیا جاتا ہے، اور ہیرو کی مبالغہ آمیز مداحی کے معنی ہی عملاً اس کے معصوم

قرار دے لینے کے ہوتے ہیں۔ کہ اب اس پر کسی قسم کی مخلصانہ تنقید بھی برداشت نہیں کی جاسکتی ہے۔ اور فرض کر لیا جاتا ہے کہ وہ کیا علمی اور کیا اخلاقی ہر قسم کی لغزش سے بالاتر تھا، اس ماحول میں صاحب برہان کا یہ جرأت مندانہ شذرہ ہر طرح داد و تبریک کا مستحق ہے۔ ترجمان القرآن میں باوجود اس کے کہ وہ تذکرہ ہی کی طرح اپنے مصنف کا ایک شاہکار ہے، ایسی ہی لغزشیں اور بھی موجود ہیں اور یہ ضروری ہے کہ کمیٹی میں کچھ اہل نظر ایسے موجود ہوں یا مقدمہ یا توضیحی حاشیوں میں اس طرف اشارے کرتے جائیں۔ اس کی بہترین اہلیت رکھنے والے مولانا سید سلیمان ندویؒ تھے، جو پہلے ہی رخصت ہو چکے۔ موجودہ لوگوں میں موزوں ترین نام خود صاحب برہان، مولانا سعید احمد اکبر آبادی کا ہے، اور پھر ایک دوسرا نام ذہن کے سامنے مولانا محمد اویس ندوی نگرامی (شیخ التفسیر دارالعلوم ندوہ) ان دونوں کی تنقیدی نظر ثانی کے بعد کتاب انشاء اللہ ہر طرح بہتر و پاکیزہ تر ہو کر نکلے گی ؎

بنمائے بہ صاحب نظرے گوہر خود را
عیسیٰ نہ تواں گشت بر تصدیق خرے چند

(۴ر جنوری ۱۹۵۸ء)

جنون تعصب سے محفوظ:

مولانا ابو الکلام آزاد مغفور کی مشہور انگریزی کتاب "انڈیا ونس فریڈم" سے:-

"فوج کا رویہ اب (یعنی ۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء کے بعد) ایک نازک مسئلہ بن گیا) تقسیم سے قبل فوج مذہبی تعصب سے پاک تھی، لیکن جب ملک کی تقسیم مذہب ہی کی بنیاد پر ہو گئی۔ تو تعصب کا زہر فوج میں بھی سرایت کر گیا۔ دہلی کی سپاہ کا بڑا حصہ ہندوؤں اور سکھوں پر مشتمل تھا، اور یہ چند ہی روز میں صاف نظر آنے لگا، کہ شہر میں امن و نظم کے قیام کے لیے کوئی سخت کارروائی کی گئی تو اس کی برداشت فوجیوں سے نہ ہو سکے گی۔ اس لیے ہم کو مزید فوج جنوب سے طلب کرنا پڑی۔ وہاں تقسیم ملک کا اثر نہیں پہنچا تھا، اور وہاں کی فوج میں فوجی اطاعت پوری طرح باقی تھی، دار الحکومت میں امن از سر نو قائم کرنے اور صورت حال کو قابو میں لانے میں بڑا حصہ جنوبی ہند کی فوج نے لیا۔" (صفحہ ۲۱۰)

عین جس وقت شمالی ہند پر شدید دورۂ جنون پڑا ہوا تھا، جنوبی ہند کا اپنے ہوش و حواس درست رکھنا کوئی معمولی بات نہیں۔ اور الحمدللہ کہ یہ توازن دماغی آج تک قائم ہے۔ مدراس اور اس کے ارد گرد کے علاقے اس وقت تک بھی جنون تعصب سے محفوظ ہیں۔

(۱۶ر اکتوبر ۱۹۵۹ء)

مولانا احمد سعید دہلوی کی رحلت:

دلی سے افسوس ناک اطلاع آئی، کہ ۴ر دسمبر یوم جمعہ کو شام کے وقت مشہور و معروف مولانا احمد سعید صاحب نے ۷۵ سال کے سن میں رحلت فرمائی۔ اور نماز جنازہ ایک جم غفیر کے ساتھ مولانا محمد یوسف صاحب (صدر جماعت تبلیغ) نے پڑھائی ـــــ ابھی کے دن کی بات ہے کہ انھیں مرحوم نے نماز جنازہ مولانا ابوالکلام کی پڑھائی تھی!

مرحوم تحریک آزادی میں پیش پیش رہنے والوں میں تھے، اور بار بار اس کی خاطر جیل گئے، اور اور بھی تکلیفیں برداشت کیں۔ یہ سب چیزیں معلوم عوام ہیں۔ مولانا خصوصی شہرت اپنی خوش بیانی کے لیے رکھتے تھے۔ اور گفتگو نج کی صحبتوں میں بھی بڑی دلچسپ کرتے تھے۔ مسلمانوں میں بعد مولانا ابوالکلام کے جو (ہند و پاکستان ملاکر) چار یا پانچ بہترین مقرر تھے۔ ان میں سے ایک وہ بھی تھے، بلکہ اگر دہلی کی زبان اور فصاحت بیان کی قید لگادی جائے تو شاید وہی نمبر اول پر تھے، مرحوم کا ایک خاص جوہر ان کی خدمت خلق تھی۔ ہر ایک کے کام آنا، ہر ایک کی امداد کو تیار ہو جانا وہ گویا اپنا فرض سمجھے ہوئے تھے، اور عجب کیا کہ ان کا یہی ایک وصف ان کی مغفوریت اور قبولیت کے لیے کافی ہو جائے۔ عمر کا آخری حصہ خدمت قرآن میں بسر ہو رہا تھا۔ اللھم اغفر لہ وارحمہ،

(۱۸۔ دسمبر ۱۹۵۹ء)

مولانا ابوالکلام کے یادگار فقرے:

مولانا ابوالکلام کے خطبۂ صدارت اجلاس کانگریس (رام گڑھ) سے :۔

"میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثہ میں آئی ہیں میں تیار نہیں کہ اس کا چھوٹے

سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں، اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کی تہذیب، اسلام کے علوم وفنون میری دولت کا سرمایہ ہے، اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں بہ حیثیت مسلمان ہونے کے مذہبی اور کلچرل دائرے میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں۔ اور میں برداشت نہیں کر سکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے۔ لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور بھی احساس رکھتا ہوں۔ جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے۔ اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی، وہ اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے، میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں۔"

مولانا کی دوسری برسی کی تقریب سے اسی فروری کے مہینے میں متعدد معاصروں نے مولانا کی تحریروں اور تقریروں کے بہت سے اقتباسات نقل کیے ہیں۔ لیکن ان بیسیوں درپچاسوں عبارتوں سے اگر اور کوئی نہ ہوتی تو صرف یہ ایک ٹکڑا ہی مولانا کی عظمت کے لیے بس تھا۔ کانگرس کی کرسی صدارت سے یہ الفاظ نکالنے آسان نہ تھے، اسی جرأت ایمانی کا ثبوت اگر مولانا محمد علی اور حسرت موہانی کے علاوہ کوئی دے سکتا تھا تو وہ مولانا ابوالکلام ہی تھے —— کاش نیشنلسٹ مسلمانوں میں کچھ تھوڑے بہت بھی مولانا کے نمونے کے ہوتے!

(۱۱ر مارچ ۱۹۶۰ء)

ایاز قدر خود بہ شناس:

علامہ سید سلیمان ندوی کے قلم سے آج سے ۴۴ سال قبل معارف جلد اول نمبر ۲ میں:-

"معارف کے اعلان نامہ کے جواب میں ایک صاحب بانکی پور سے تحریر فرماتے ہیں۔

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، چونکہ آپ اور آپ کی جماعت مولانا ابوالکلام آزاد . . . . . کی مخالف ہے۔ اور ان کی عیب جوئی کرتی ہے۔ اس لیے میں آپ کے پرچہ کا خریدار ہونا کبھی منظور نہیں کر سکتا، زیادہ والسلام۔ آئندہ

سے احتیاط "۔

اس آزادی اور حریت کے شیدائی نے اپنا واضح نام لکھنے کے بجائے اپنے مرموز دستخط پر قناعت کی ہے، نام کا ایک جزو شاید محی ہے، عجب نہیں کہ بیرسٹر بھی ہوں۔ مولوی ابوالکلام آزاد سے شاید ان کو اس وقت سے واقفیت ہو جب وہ مولانا ابوالکلام آزاد "رحمۃ اللہ علیہ" ہیں، لیکن مجھ کو ان کی خدمت میں اس وقت سے نیاز ہے جب وہ ابوالکلام آزاد بھی نہ تھے، بہتر تو یہ تھا کہ میں اپنے اور ان کے تعلقات کی توضیح کے لیے ان کے آخریں خطوط شائع کر دیتا، لیکن اس سے بہتر یہ ہے کہ ہر نادان سے الجھ جانا سلامت روی نہیں۔ اور اگر بالفرض یہ سچ بھی ہو، تو یہ کس آئین حریت کا اقتضا ہے، کہ زید، عمر کا اگر مخالف ہے تو اس کے انتساب کی ہر نیک و بد شے ممنوع ہو جائے، عصبیت رائے درحقیقت اس نخل بار آور کا ثمر ملعون ہے۔

سنا ہے کہ علی گڑھ کالج کے ایک نیم تعلیم یافتہ نوجوان[1]، جن کی رگوں میں سیادت ہاشمی کا خون اب تک جوش مارتا ہے۔ اسی قسم کی غلط فہمی وہ بھی لوگوں میں پھیلا رہے ہیں۔ کوئی ان دوردستان نزدیک سے پوچھے کہ اگر اہل خلوت میں باہم تخالف آرا بھی ہو، تو بیگانہ دشوں کو جھانک تاک اور خلل اندازی کی کیا ضرورت ہے۔ مولانا ابوالکلام کا حقیقی قدر شناس ہم سے زیادہ کوئی نہ ہوگا۔ لوگوں نے سنا ہے، اور ہم نے دیکھا ہے، تاہم ہم ان کو انسان ہی سمجھتے ہیں ع

گر فرق مراتب نہ کنی زندیقی !

(معارف اعظم گڑھ بابت اگست ۱۹۱۶ء ص ۱۰۲) زیر خط بعض فقرے نقل میں کر دیے گئے ہیں)۔

جواب ان سطروں میں، اس خوش ظرف اہل قلم[2] کا آگیا ہے۔ جس نے حال میں مولانا ابوالکلام کی خدمت کی آڑ میں ایک کتاب[3] میں علامہ ندوی پر کیچڑ اچھالنے میں اپنا پورا زور لگا ڈالا ہے، اور چاند پر خاک ڈالنے کی کوشش میں اپنے ہی کو خاک آلود کر لیا ہے ـــــ "ایاز قدر

---

[1] سید ہاشمی فرید آبادی کی طرف اشارہ ہے۔ [2] اہل قلم: مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی مرحوم اور کتاب: ذکر آزاد

خود بہ شناس"، بھی اس کو اس موقع پر یاد نہ آیا۔

(۱۸ مارچ ۱۹۶۰ء)

ایک مفید تجویز:

معروف لیکن گمنام مجاہد ملت مولانا لقاء اللہ صاحب عثمانی پانی پتی کے تازہ مکتوب سے:-

"یہ عریضہ خاص طور پر اس خواہش کے اظہار کے لیے ارسال خدمت ہے کہ اخبار ہمدرد اور کامریڈ میں مولانا محمد علیؒ کے افتتاحیہ مقالے جو شائع ہوئے ہیں۔ وہ کتابی صورت میں ایک جگہ شائع ہو جائیں۔ اس وقت یہ مضامین مردہ قوم میں زندگی پیدا کر سکتے ہیں، اسی طرح الہلال اور البلاغ کے افتتاحیے بھی مسلمانوں کے لیے مفید ثابت ہو سکتے ہیں، ان کا بہت سا حصہ میرے پاس موجود تھا، لیکن ۱۹۴۷ء کے ہنگامے نے سب برباد کر دیا۔ امید ہے کہ ان کے فائل آپ کے پاس موجود ہوں گے، اگر نہ ہوں تو صدق کے ذریعہ معلوم ہو سکتا ہے (اللہ اس پرچے کو ہمیشہ قائم وسلامت رکھے) مکمل فائل یا ان کا زیادہ حصہ حاصل ہو سکے تو کسی صاحب قلم کو منتخب فرما کر اپنی زندگی میں یہ کام بھی کرا جائیں، جناب کو اس طرف متوجہ کرنا بڑی جسارت ہے۔ لیکن کوئی اور نظر بھی تو نہیں آتا۔ اس زمانہ میں اصحاب علم وسیاست میں سے ہر شخص کے متعلق آپ سے زیادہ علم کس کو ہوگا۔ کہ کس سے کیا کام لیا جائے۔"

تجویز مولانا کے جذبۂ اخلاص کی آئینہ دار ہے۔ باقی اس کی افادیت اب درجۂ اول کی نہیں۔ ہر دور کے تقاضے کچھ اور ہی ہوتے ہیں۔ الہلال، ہمدرد، کامریڈ وغیرہ نے اپنے زمانے میں جو کام انجام دیا، وہ واقعی بڑا کام تھا۔ تاہم ان کے منتخب مقالے اور شذرے دیباچہ اور حواشی کے اضافہ کے ساتھ کسی حد تک اب بھی مفید ہو سکتے ہیں۔ مدیر صدق کے پاس اتنا وقت کہاں، کہ وہ اپنے اہم تر شغلوں (خصوصاً تفسیر قرآن کی نظر ثانی کے کام) کو اپنی عمر کے آخری حصہ میں چھوڑ کر کسی اور طرف متوجہ ہو۔ البتہ اگر کوئی اور صاحب اس

خدمت کی ہمت کریں، تو صلاح و مشورے سے ان کی رہنمائی کرنے کو ہر وقت حاضر ہے۔

(۱۱ راگست ۱۹۶۱ء)

ایک عجیب تحریر:

جماعت اسلامی کے ایک لاہوری ہفتہ وار سے۔ ہمیں سرگودھا سے مولانا ابوالکلام سے منسوب ایک تحریر بھیجی گئی ہے۔ اس کا عکس ایک نئی کتاب اسلام بیسویں صدی میں "شائع کیا گیا ہے۔ ہم اس سلسلے میں کوئی خاص تحقیق نہیں کر سکے، مگر ہمارے دوست . . . . جو مولانا ابوالکلام کے بارے میں ہم سے کہیں زیادہ جانتے ہیں، یہ فرماتے ہیں کہ یہ تحریر جعلی ہے . . . . صاحب نے جو دلائل دیے ہیں، ان سے قطع نظر اس خط میں یہ بات خاص طور پر کھٹکتی ہے کہ اس میں فارسی کا جو شعر درج کیا گیا ہے۔ وہ غلط ہے . . . . .

(اس کے بعد اصل خط یوں نقل ہوا ہے)

کنگ اڈورڈ روڈ۔ دہلی ۵۷/۴/۱۱

عزیزم۔ علیکم السلام۔

عدم توجہگی و شکایت بے التفاتی بجا، مگر کیسے کہوں اور کیا!

؎ کس نمی فہمد زبان را   عزیزاں چہ بیان کنم

منصب افتاء کی ذمہ داریوں سے دامن ہمیشہ الگ رکھا، استفتاء کے لیے کسی صاحب منصب کی طرف راجع ہونا چاہیئے تھا۔ میری رائے میں مسئلہ مہدی کا اقرار و انکار برابر اور امور ایمانیہ سے خارج ہے، مزید توضیح کے لیے تذکرہ دیکھیں۔

مولانا ابوالاعلیٰ کی خدمات جلیلہ سے امت مسلمہ کبھی صرف نظر نہیں کر سکتی۔ کہ ایسے کارہائے نمایاں تاریخ تجدید اسلام کے ہر باب و فصل کے لیے سرمایہ افتخار و ہم درجہ عنوان ہیں۔ مولانا گلشن حق کے ان لالہ و سنبل میں سے ہیں۔ جن کی خوشبو سدا بہار ہمیشہ تعفن باطل کو مغلوب کر کے طالبان حق کے دل و دماغ کو معطر کرتی ہے۔ اور جسے فنا نہیں۔

ثبت ست بر جریدۂ عالم دوام ما۔

ابوالکلام "

ان بحثوں کو چھوڑیے کہ مولانا مرحوم کا یہ طرز تحریر اپنے ہم عصر مسلم فاضلوں سے متعلق تھا بھی۔ یا یہ کہ ان سے قرب رکھنے والوں کے بیان کے مطابق ان مرحوم کے یہ خیالات مولانا مودودی سے متعلق تھے بھی۔ ان سب سے قطع نظر کرکے یہ سوچیے کہ مولانا کے قلم سے سہو و غفلت میں بھی "عدم توجہگی" نکل سکتا تھا؟ اور پھر یہ فرمائیے کہ ایسا شعر جس کے دونوں مصرعہ غلط در غلط ہوں، اور جس کا وزن تک درست نہ ہو۔ کبھی بھی ان کا قلم ادا کر سکتا تھا! پھر "مولانا گلشن حق کے اُن" سے لے کر "جسے فنا نہیں" تک کی عبارت مولانا کے حسن انشاء سے کچھ بھی میل کھاتی ہے؟ اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھیے کہ مولانا کا وہ مرصع و مطلا اسلوب بیان۔ جو اس خط میں استعمال ہوا ہے۔ صرف دور الہلال اور اس کے چند سال بعد تک محدود رہا ہے۔ اور اس کے بعد مولانا کے قلم نے اپنے کو سادگی و سلاست کا خوگر کر لیا تھا۔ اس مکتوب کی تحریر کے وقت وہ اپنے عالم شباب کی طرف کیسے واپس چلے گئے؟ یہاں تک کہ خط بھی بجائے حسب معمول اپنے پرائیوٹ سکریٹری اجمل خاں صاحب سے لکھانے کے۔ خود اپنے ہاتھ سے لکھ ڈالا! —— غرض اتنے شکوک و شبہات کے بعد"

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے"!

(۹ مارچ ۱۹۶۲ء)

مصنف نے اپنی کتاب "اسلام بیسویں صدی میں" میں اس خط کا عکس شائع کیا تھا، لیکن جب اس خط کی صحت کو چیلنج کیا گیا اور ان سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ اصل خط پیش کریں تو انھوں نے عذر کیا کہ اصل خط ضائع ہو گیا۔ اس سلسلے میں چٹان، ایشیا، شہاب وغیرہ میں بحث آئی تھی اور بحث میں حصہ لینے والے تھے شورش کاشمیری، مولانا نصر اللہ خاں عزیز، مولانا کوثر نیازی، مولانا غلام رسول مہر وغیرہ، سب کا اتفاق اسی پر تھا کہ یہ خط جعلی ہے۔

مسلمان اور جنگ آزادی:

قومی بک ڈپو کونسل کی اشوک مہتہ کمیٹی کے سامنے جمعیۃ العلماء کا جو وفد پیش ہوا۔ اس کے سوال و جواب اور اس پر جرح کے سلسلے میں لکھنؤ کے ایک اسلامی ہفتہ وار کا شکوہ:۔

[یوپی، کی بیسک ریڈروں میں] کانگرس کی جنگ آزادی کے سلسلے میں ایک اکیلے

مولانا ابوالکلام آزاد کا نام آتا ہے۔ اس پر کمیٹی کے ایک ممبر کا ارشاد ملاحظہ ہو۔

"جدید تاریخ میں صرف مولانا آزاد ہی کا نام اس لیے نظر آتا ہے کہ مسلم زعما میں اُن ہی کی شخصیت تھی۔ جو گاندھی جی کی طرح شروع ہی سے آزادی کی علمبردار رہی ہے، اور پھر اس کے ساتھ یہ تیکھا جملہ بھی ارشاد ہوا کہ مسلمان رہنماؤں میں ان کے سوا کون ہے، جس کا نام اس درجہ میں لیا جا سکے"

جی بالکل بجا ارشاد ہوا۔ مولوی برکت اللہ اور مولانا عبیداللہ سندھی، حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری، حسرت موہانی اور رفیع احمد قدوائی، ڈاکٹر سید محمود اور سب سے پیچھے (اگر کسی سے پیچھے نہیں) حیات اللہ انصاری یا تو اس کے قابل ہی نہیں، کہ انھیں رہنماؤں کی صف میں رکھا جائے۔ اور یا یہ کہ یہ سرے سے مسلمان ہی نہ تھے! — رہا مولانا ابوالکلام کا نام تو شکر بھیجنا چاہیے کہ ابھی ایک نام تو ایسا ہے جو ٹیکسٹ ریڈر والوں کے نکالے بھی نہ نکل سکا۔ ورنہ کل اگر کوئی صاحب یہی دعوے کر بیٹھیں کہ مولانا مسلمان تھے کب۔ وہ تو فیثا غورث یونانی کے مذہب و مشرب پر تھے۔ تو فرمائیے۔ ہندوستان کے کروڑوں مسلمان مل کر بھی کیا کر لیں گے!

(۵ اکتوبر ۱۹۶۲ء)

اسلام اور سرزمین ہند:

مولانا ابوالکلام آزاد کے خطبہ صدارت کانگریس منعقدہ رام گڑھ ۱۹۴۰ء سے، بشکریہ "ندائے ملت" لکھنؤ:۔

"ہندوستان کے لیے یہ قدرت کا فیصلہ ہو چکا تھا کہ اس کی سرزمین انسان کی مختلف نسلوں، مختلف تہذیبوں اور مختلف مذہبوں کے قافلوں کی منزل ہے، ابھی تاریخ کی صبح نمودار ہوئی تھی کہ ان قافلوں کی آمد شروع ہو گئی، اور پھر یکے بعد دیگرے سلسلہ جاری رہا۔ اس کی وسیع سرزمین سب کا استقبال کرتی رہی، اور اس کی فیاض گود نے سب کے لیے جگہ نکالی۔ ان ہی قافلوں میں آخری قافلہ ہم برادرانِ اسلام کا بھی تھا۔ یہ بھی پچھلے قافلوں کے نشان راہ پر چلتا ہوا یہاں

پہنچا، اور ہمیشہ کے لیے بس گیا، یہ دنیا کی دو مختلف قوموں اور تہذیبوں کے دھاروں کا ملان تھا، یہ گنگا جمنا کے دھاروں کی طرح پہلے ایک دوسرے سے الگ بہتے رہے، لیکن پھر جیساکہ قدرت کا اٹل قانون ہے دونوں کو ایک سنگم میں مل جانا پڑا۔ ان دونوں کا میل تاریخ کا ایک عظیم واقعہ تھا، جس دن یہ واقعہ ظہور میں آیا، اسی دن سے قدرت کے مخفی قوتوں نے پرانے ہندوستان کی جگہ ایک نئے ہندوستان کے ڈھالنے کا کام شروع کر دیا۔

تاریخ کی پوری گیارہ صدیاں اسی واقعہ پر گزر چکی ہیں، اب اسلام بھی اس سرزمین پر ایسا ہی دعویٰ رکھتا ہے، جیسا دعویٰ ہندو مذہب کا ہے، اگر ہندو مذہب کئی ہزار برس سے اس کے باشندوں کا مذہب رہا ہے، تو اسلام بھی ایک ہزار برس سے اس کے باشندوں کا مذہب چلا آتا ہے، جس طرح آج ہندو فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ وہ ہندوستانی ہے اور ہندو مذہب کا پیرو ہے، ٹھیک اسی طرح ہم بھی فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں، کہ ہم ہندوستانی ہیں اور مذہب اسلام کے پیرو ہیں۔"

مولانا کے کلام میں ایک حکیمانہ اور ادیبانہ شان تو ہوتی ہی تھی، جن آخری سطروں کو یہاں نقل میں زیر خط کر دیا گیا ہے۔ وہ جس جرأت کا اظہار کر رہی ہیں وہ بھی کانگریس کے تخت صدارت سے اور ۱۹۴۰ء میں یہ بھی مولانا ہی کا حصہ تھا —— اب اتنی صاف واضح حقیقت بھی لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی، ان کے دلوں، دماغوں کو کھول دینا کسی بندہ کا نہیں صرف اللہ ہی کا کام ہے۔

(۲۱ر دسمبر ۱۹۶۲ء)

فرنچ مستشرق کی موت:

پچھلے مہینے فرانس سے مشہور مستشرق پروفیسر موسیٰ مینو کی وفات کی افسوسناک اطلاع آئی ..... جو مستشرقین اسلام کے بہت ہمدرد اور مسلم نواز سمجھے جاتے ہیں، انھیں میں ایک ان کا بھی شمار تھا۔

مولانا ابوالکلام سے ان کے اوائل عمر میں بغداد میں علامہ محمود آلوسی (صاحب تفسیر روح المعانی) کے لڑکے یا پوتے کے ہاں مل چکے تھے۔

(یکم مارچ ۱۹۶۳ء)

غلط تبلیغ :

ہندوستان کے ایک صاحب اقتدار مسلمان نے تقریر میں کہا کہ قرآن میں یہ حکم دیا گیا ہے :

"ہم اس ملک سے محبت رکھیں جہاں ہم رہتے ہیں" مولانا دریابادی نے ان سے اپنے اخبار کے ذریعے دریافت فرمایا: قرآن کے جس فرمان کا حوالہ دیا گیا ہے آخر وہ فرمان قرآن میں کہاں ہے؟

پھر فرمایا!

"افسوس ہے کہ لوگ قرآن کے مبادیات کا بھی علم رکھے بغیر قرآن پر گفتگو شروع کر دیتے ہیں اور ابوالکلام کا علم و نظر رکھے بغیر ابوالکلام ہو جانا چاہتے ہیں۔

(۱۳ ستمبر ۱۹۶۳ء)

نئے جانشین مولانا ابوالکلام :

نئے وزیر تعلیمات ہند مسٹر محمد کریم چھاگلا جن کی قسمت میں مولانا ابوالکلام کی جانشینی آئی ہے، ان کا تعارف اسٹیٹسمین کے صفحات میں، اس کے مشہور وقائع نگار کرشن بھاٹیا کے قلم سے :

"خیر چھاگلا صاحب کا سیاسی ماضی و حال جو کچھ ہو، اسے تو پنڈت جی ہی جانیں، اور ان کے مشیر و رفیق"

رموز مملکت خویش خسرواں دانند

صدق غریب کو اس بحث سے کیا دلچسپی، لیکن مذہبی پہلو سے تو اسے بھی ہر مسلمان کی طرح زبان کھولنے کا حق ہے۔ مولانا ابوالکلام تو خیر بڑی چیز تھے۔ ان کا بدل اب پنڈت جی کو کہاں سے ملے گا، لیکن یہ جدید وزیر صاحب کیا رفیع احمد قدوائی مرحوم یا حافظ محمد ابراہیم صاحب سی اسلامیت بھی اپنے اندر رکھتے ہیں؟

(۶ دسمبر ۱۹۶۳ء)

زبان کا اتار چڑھاؤ:

...... کسی ادیب کے مضمون سے ایک اقتباس پر تبصرہ۔

زبان کا بھی عجب حال رہتا ہے، وہی لفظ جو ایک زمانے میں صحیح بلکہ فصیح سمجھے جاتے ہیں کچھ روز بعد بدلے ہوئے تمدن، معاشرت اور فضا و ماحول کے ماتحت غیر فصیح، غریب، نامانوس سے لگنے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ متروک قرار پا جاتے ہیں، اور بعض دفعہ یہ تماشہ شاعر، مصنف، اہل قلم کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا پڑتا اور اس پر صبر کرنا پڑتا ہے۔ مجلہ، مدیر مسئول، بدل اشتراک، اسبوعیہ، بریدِ فرنگ، سنین ماضیہ، محیر العقول، حادثہ فاجعہ قسم کے خدا معلوم کتنے لفظ مولانا ابوالکلام نے اپنے ابتدائی دور میں اردو میں چلائے اور پھر اخیر عمر میں، اس کے برعکس اردو کو بجائے عربی آمیز بنانے کے بالکل سادہ رکھنے کی کوشش کرنے لگے تھے۔

(۲۴ر اپریل ۱۹۶۴ء)

مینگنی بھرا دودھ:

"لکھنؤ ۹ر دسمبر۔ جنگ آزادی کے مشہور رہنما، سابق وزیر تعلیمات ہند مولانا ابوالکلام آزادؒ کا مجسمہ یہاں رفاہ عام کلب کے سامنے پارک میں آیندہ مہینے نصب کیا جانے والا ہے، یہ انکشاف شہر کے میئر کیپٹن وی، آر، موہن نے ایک ملاقات میں کرتے ہوئے بتایا کہ تحریک خلافت و ترک موالات کا بڑا تعلق رفاہ عام کلب سے رہا ہے۔ اور نہ صرف مولانا آزاد بلکہ گاندھی جی، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی اور پنڈت موتی لال نہرو اور اس رتبہ کے اور تمام قومی رہنما قومی جلسوں کو یہیں خطاب کر چکے ہیں۔ یہ مجسمہ میئر صاحب نے اپنے کارخانے میں اپنی ہی نگرانی میں تیار کرایا ہے۔"

"آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا، کہ یوں" کسی مسلمان لیڈر کی یادگار کا خیال تو خدا خدا کر کے پیدا ہوا۔ اس سے خوشی کس کو نہ ہوگی، لیکن قدردانی کی جو صورت تجویز ہوئی، اس نے ساری مسرت پر اوس ہی ڈال دی، یادگار کا ایک مجسمہ یا مورتی کی صورت میں کسی مسلمان کی بھی جیسی ہو سکتی ہے، ظاہر ہے۔ چہ جائیکہ مولانا مرحوم کی، جو اپنے عقیدۂ و مسلک

میں ابن تیمیہؒ کی راہ پر تھے! حضرت اکبر کی زبان میں۔ ع

یاروں نے بُت شکن کو بُت ہی بنا کے چھوڑا!

عقلاً بھی یہ سمجھ میں آنے والی چیز نہیں کہ ہزارہا روپیہ خرچ کرکے بجائے کسی کتب خانے یا اور کسی مفید ادارے قائم کرنے کے۔ پتھر یا کسی دہات کا ایک بُت کہیں نصب کر دیا جائے، تو آخر اس سے کسی کو نفع کیا حاصل ہوگا! غرض "خوشخبری" ایسی ہے۔ جو بدخبری کو بھی اپنے جلو میں لیے ہوئے ہے۔ بقول شاعر ؎

ہمراہِ عدو آئے وہ یاں ہائے قیامت
اک اور بھی ساتھ اپنے لگا لائے قیامت!

(۱۸ دسمبر ۱۹۶۴ء)

قومی دھارے سے قبل:

مولانا ابوالکلام صدر کانگریس کی تقریر ۱۹۳۹ء میں (بہ شکریہ ندائے ملت):۔

"گزشتہ سال آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس کلکتہ میں جو تجویز پاس ہوئی تھی۔ وہ میں نے ہی لکھی تھی۔ بعد میں جواہر لال نے اس میں کچھ ترمیم کی، اس میں ایک قدم اور آگے بڑھا کر کہا گیا ہے کہ ہم نہ صرف اقلیتوں کے رسم خط، زبان، کلچر وغیرہ کو محفوظ رکھیں گے۔ بلکہ انھیں اور ترقی بھی دیں گے۔ اس تجویز کا صاف مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کی اجتماعی اور ملی حیثیت کو ہندوستان کی قومیت میں جذب کر دینا کانگریس کا مدعا ہرگز نہیں، اور مسلمانوں کو صاف طور سے چلا کر اور پکار پکار کر یہ اعلان کر دینا چاہیے، اور اس اعلان کو ہر در و دیوار پر نقش کر دینا چاہیے کہ وہ ہندویت میں جذب ہونے کو ایک لمحہ کے لیے بھی تیار نہیں۔ بہ حیثیت ایک مسلمان کے ان کی جو قومی خصوصیات ہیں، ان کو وہ نہ صرف باقی رکھیں گے، بلکہ ترقی دیں گے۔"

مگر ایسے وعدے وعید عہد و پیمان سے ہوتا کیا ہے۔ ۳۹ء کا کون سا عہد۔ اور ابوالکلام کا نہیں، گاندھی جی اور جواہر لال کا بھی کیا ہوا، ۴۷ء میں باقی کب رہنے پایا

ہے۔ یہ تو وہ وقت تھا کہ جب نہ جن سنگھ کا وجود تھا، اور نہ راشٹریہ سیوئک سنگھ کا! اور سب سے بڑھ کر یہ کہ "قومی دھارے" کی فصیح و بلیغ جامع وہمہ گیر اصطلاح کہاں ایجاد ہوئی تھی!

یہ قصّہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا!

حق یہ ہے کہ اپنے دیس کی اکثریت کو مولانا ابوالکلام تو کیا جانتے۔ جب گاندھی جی تک اس کو پہچان نہ سکے۔ یہاں تک کہ اپنی جان اس سیدھے پن اور حسن ظن کی نذر کر بیٹھے اور سوئی صدی دھوکے میں پڑے رہے۔

. . . .

کاش آج سیکولر حکومت کے صدر صاحب کی زبان سے کوئی اس کی آدھی بات بھی کہلا سکتا!

(۵ رجولائی ۱۹۶۸ء)

نیشنلسٹ کی زبان سے:

مولانا ابوالکلام کی ایک تقریر ۱۹۴۷ء کا آخری حصّہ:

"عزیزو! میرے پاس تمہارے لیے کوئی نیا نسخہ نہیں ہے۔ چودہ سو کا پرانا نسخہ ہے۔ وہ نسخہ جس کو کائناتِ انسانی کا سب سے بڑا محسن لایا تھا۔ اور وہ نسخہ ہے قرآن مجید کا یہ اعلان کہ وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ۝ (ڈرو نہیں اور نہ غمزدہ بنو تمھیں غالب آؤ گے اگر تم مومن رہے)"

خوب خیال کرلیجیے، یہ تقریر اُن مولانا ابوالکلام کی نہیں ہے جو ۱۲ء و ۱۳ء میں الہلال کے ایڈیٹر اور قرآن کے داعی تھے۔ یہ ان ابوالکلام کی ہے، جو ۴۷ء میں وزیر مرکزی ہو چکے یا وزیر بننے جا رہے تھے، اور ہند کو سوراج حاصل ہو چکا تھا! آج کوئی کاش اتنا کہنے والا بھی ہوتا! ـــ مولانا کو نہ یہ خوف آیا کہ کوئی ان کی سیکولرازم کا طعن کرے گا اور نہ اس کا اندیشہ پیدا ہوا کہ کوئی ان کی فرقہ پرستی کا چرچا شروع کر دیگا۔

(۲۶ رجنوری ۱۹۶۸ء)

ابوالکلام کی دعوت :

مولانا ابوالکلام کا ایک پیغام مسلمانوں کے نام، جسے ہم عصر "ندائے ملت" (لکھنؤ) نے ابھی یاد دلایا ہے :-

"تمہارا اصلی کام کوئی خاص مسئلہ اور کوئی خاص تحریک نہیں ہوسکتی، ہمیشہ سے اور ہمیشہ کے لیے صرف یہی ہوسکتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو مسلمان بننا چاہیے۔ اور قوم و فرد دونوں اعتباروں سے ٹھیک ٹھیک اسلامی زندگی اختیار کرنا چاہیے۔ اس ایک کام کے انجام پانے پر سارے کام خود بخود انجام پا جائیں گے۔"

مولانا مرحوم تو مسلمان قوم پروروں کے امام کہے جاتے ہیں۔ لیکن کیا مسلمانوں کے کسی بڑے سے بڑے فرقہ پرور کا پیام بھی اس سے کچھ زیادہ یا اس کے کچھ علاوہ ہے؟

(۲۷ ستمبر ۱۹۶۸ء)

سچی باتیں :

مولانا ابوالکلام آزاد حکیم و عارف ہوں یا نہ ہوں، بہرحال ان کی تحریروں میں کہیں کسی سے منقول، کہیں کسی اور طریقہ سے نکتے حکمت و معرفت کے اچھے خاصے مل جاتے ہیں۔ اپنی پرانی کتاب تذکرہ ہیں، جس کی معنوی بلندی، ادبی شگفتگی اور انشائی تازگی سدابہار سی ہیں، ایک جگہ ایران کے مشہور شاعر ابوطالب کلیم کے دو شعر نقل کیے ہیں، اور ان دو شعروں کے اندر، شاعر نے واللہ اعلم کہاں سے حاصل کر کے حسرت و یاس کوٹ کر بھر دی ہے۔

بدنامیِ حیات دو روزے نبود بیش وآں ہم کلیم با تو گویم چساں گذشت	زندگی یا جسے اتہام زندگی کہیے ملی ہی کتنی؟ کل دو دن کی۔ اور اس دو دن کی سرگزشت بھی کلیم اب کیا بیان کیجیے۔
یک روز صرف بستن دل شد بہ این آں روزِ دگر بہ کندن دل زین و آں گذشت	اس عمر دو روزہ کا ایک دن تو مالوفات زندگی سے دل لگانے میں صرف ہوگیا،

اور دوسرا دن انھیں مالوفات سے دل ہٹانے میں!

اور جہاں تک اثر کا تعلق ہے یہ شاعری نہیں ہے۔ حکایت واقعہ ہے۔

وہی زندگی، جس کا پھیلاؤ بچپن اور لڑکپن ہیں غیر محدود معلوم ہوتا ہے، آخر میں کتنی محدود مختصر اور کیسی سکڑی، سمٹی ہوئی نظر آنے لگتی ہے! پیدائش ابھی کل کی بات معلوم ہوتی ہے۔ لڑکپن گویا ہوا کا تیز جھونکا تھا کہ آیا اور سن سے نکل گیا۔ شباب گویا ایک تیر تھا، کہ فرّاٹا بھرتا ہوا گزرتا چلا گیا! اور سن کہولت ہے کہ اپنی تیز رفتاری میں بجلی کو شرماتے ہوئے ہے! جسمانی اور مادی اعتبار سے ہر چیز جو عمر کے کسی دور میں بھی لطف و لذت کی ملی تھی، وہ کتنی ناپائدار، کتنی بے ثبات، کتنی بے وفا نکلی! آدھی عمر اس بے وفا دنیا سے دل لگانے میں بیت گئی، اور بقیہ نصف آنکھوں سے پردے اٹھنے میں کٹی جارہی ہے! —— کلام کی قدر نوجوانی میں نہیں، پختگی کا سن آجانے پر، تجربہ کے بعد ہوتی ہے! اور اسی منزل پر پہنچ کر اکبر الٰہ آبادیؒ کے کلام کی بھی حقیقت فاش ہوتی ہے ؎

حسن ہے بے وفا بھی، فانی بھی
کاش سمجھے اسے جوانی بھی!

مراسلہ نگاروں سے

صدق جدید کے بہت سے مراسلوں اور صدق کے جوابوں میں ذکر مولانا ابوالکلام آزاد کا بھی آیا، اسی قسم کے کچھ مراسلے یہ ہیں۔ کچھ مراسلے کسی موضوعاتی تقسیم کے تحت درج ہوتے ہیں۔

ایک مثالی مراسلہ

مبارک ہو مولانا صاحب! وہ عظیم شخصیت جو ہمیشہ آپ کو کھٹکتی رہی، اب ہمیشہ کے لیے آپ کے لیے جگہ خالی کر گئی۔ آپ بھی تو اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ "اردو ہی کی بدولت آپ کی ادبیت، صحافت و ذہانت کے جواہر سہ گانہ چمکے اور آپ کو برعظیم ہندو پاک میں یہ شہرت نصیب ہوئی۔ آپ ہی بڑھیے اور بسم اللہ کیجیے ——— لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ۔ ——— فتدبر ——— کہ اَلْحَقُّ مُرٌّ"

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔ والسلام علیکم ورحمت اللہ وبرکاتہ،

مخلص و حسن ظن رکھنے والا ——— عبدالسلام ندوی کوہاٹی

بالائی منزل انشا پریس، اردو بازار۔ لاہور

صدق۔ اس مبارکباد کا شکریہ کس زبان سے ادا کیا جائے۔ ایسے مخلص و حسن ظن رکھنے والے عنایت فرما ملتے کس کو ہیں۔ لیکن یہ مبارکباد تو قبل از وقت سی رہی۔ "وہ عظیم شخصیت" جو ہمیشہ مکتوب الیہ کو کھٹکتی رہی۔ اگر اٹھ گئی ہو۔ تو کیا ہوا۔ عظیم تر شخصیت جناب والا کی تو ابھی ماشاء اللہ صحیح سلامت موجود ہی ہے۔ پھر مکتوب الیہ کے سینۂ پُر کینہ سے حسد کی کھٹک کیوں کر دور ہو سکتی ہے؟

مراسلہ بالا جو ایک لفافہ کے اندر مولانا ابوالکلام کی وفات پر موصول ہوا، اور وہ بھی ایک

ایک "ندوی" کے قلم سے بجنسہ درج کر دیا گیا - اور اس قسم کے دلآزار خط ہر ہفتہ اگر نہیں تو ہر مہینہ تو دو ایک وصول ہو ہی جاتے ہیں الحق مُرّ کی یہ تفسیر بھی خوب ہے کہ کڑی سی کڑی بات بھی بلا شائبہ ثبوت و شہادت زبان سے اُگل دی جائے اور اس پر لیبل "حق" کا لگا دیا جائے!
بیچاروں سے ہمدردی ہوتی ہے کہ اپنے پیسے ڈاک میں خرچ کر کے کچھ تو اپنے دل کا بخار نکال ہی لیتے ہیں - حشر میں عجب نہیں کہ یہ مراسلہ خود مولانا مرحوم کے ہاتھ میں دے کر انھیں سے اس کی داد چاہی جائے -

(۱۴ر مارچ ۱۹۵۸ء)

حکیم قاری احمد صاحب پیلی بھیتی (کراچی)

مولانا ابوالکلام مرحوم و مغفور کی تعزیت کے لیے مدیر صدق کو انتخاب کرنے میں آپ نے غلطی نہیں کی - اپنے بعض خصوصیات کے لحاظ سے ان کی ذات واقعی بے مثال تھی - اللہ بال بال مغفرت فرمائے -

(۱۴ر مارچ ۱۹۵۸ء)

رشید احمد صاحب جالندھری (قاہرہ)

۶ر صفحہ کا ضخیم مکتوب موصول ہوا - سید الملت فخر المتاخرین، اور "نقوش سلیمانی" کے ذکر سے اگر قلب اذیت محسوس کرتا ہے تو اس کا اصل علاج یہ ہے کہ ایسے پرچہ کا مطالعہ ہی ترک کر دیا جائے، نہ یہ کہ پرچہ کو اس ذکر خیر کے ترک کی ہدایت کی جائے -
مولانا آزاد کے سفر عراق کے "مہمل موضوع" کو صدق نے کب کب موضوع سخن بنائے رکھا ہے، اس کی خبر آپ کو ہوگی، مدیر صدق کو نہیں -
قلمی صلاحیتوں کے بابت جو کچھ ارشاد ہوا ہے - اس کی حیثیت بھی مشورہ سے کہیں بڑھ کر تہدید کی ہے -

(۱۲ر اگست ۱۹۶۰ء)

محمد قاسم بھوپال کے مراسلے کے جواب میں

مولانا ابوالکلام کا وہ رسالہ شیخ فرید وجدی مصری کے رسالہ "المراۃ المسلمہ" کا اپنایا ہوا ترجمہ

ہے۔ مولانا نے یہ ۱۹۰۵ء میں کیا تھا، جب وہ ایک نوعمر و ہونہار اہل قلم کی حیثیت سے ماہ نامہ الندوہ (لکھنؤ) کے اسٹاف میں شامل تھے۔

(۲۵ اگست ۱۹۶۱ء)

ایک حل طلب عبارت

گزارش یہ ہے کہ۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ کی انگریزی کتاب کا پروفیسر مجیب صاحب نے اردو ترجمہ "ہماری آزادی" کے نام سے کیا ہے۔

اس میں مطالعہ کے دوران مندرجہ ذیل عبارت بھی نظر سے گزری چونکہ اس میں اسلام کے متعلق خیال ظاہر کیا گیا ہے اس لیے گزارش ہے کہ آں محترم بھی اس پر نظر فرمادیں۔ اور مولانا نے اسلام کے متعلق جو خیال ظاہر فرمایا ہے اس کی کیا توجیہہ ہو سکتی ہے مطلع فرمادیں۔ نوازش ہوگی!

عبارت یہ ہے :— "یہ کہنا عوام کو ایک بہت بڑا فریب دینا ہے کہ صرف مذہبی یگانگت دو ایسے علاقوں کو متحد کر سکتی ہے جو جغرافیائی، معاشی، لسانی اور معاشرتی اعتبار سے ایک دوسرے سے بالکل جدا ہوں۔

اس میں شک نہیں کہ اسلام نے ایک ایسے معاشرے کے قیام کی کوشش کی جو نسلی، لسانی، معاشی اور سیاسی حد بندیوں سے بالاتر ہو۔ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ شروع کے چالیس برسوں کو یا زیادہ سے زیادہ پہلی صدی کو چھوڑ کر اسلام کبھی سارے مسلمان ممالک کو صرف مذہب کی بنیاد پر متحد نہ کر سکا[1]" (ہماری آزادی صد ۲۵۳)

---

[1] مولانا غلام رسول مہر مرحوم کا بیان تھا کہ یہ نہ مولانا آزادؒ کی زبان ہے، نہ اسلوب۔ ان الفاظ کی ذمہ داری مولاناؒ پر آتی ہی نہیں۔ مہر صاحب مرحوم کا خیال تھا کہ مولانا نے یہ بات مسلمانوں کے حوالے سے کی ہوگی، مرحوم کے نزدیک مولاناؒ کا مفہوم یہ ہوگا: "اس میں شک نہیں کہ تاریخ اسلام کے ابتدائی دور کے بعد ہی سے مسلمانوں نے ایک ایسے معاشرے کے قیام کی کوششیں جاری رکھیں، جو نسلی، لسانی، معاشی اور سیاسی حد بندیوں سے بالاتر ہو، لیکن تاریخ شاہد ہے کہ زیادہ سے زیادہ پہلی صدی کو چھوڑ کر مسلمان سارے مسلمان ممالک کو صرف مذہب کی بنیاد پر متحد کرنے کی کوششوں میں کبھی کامیاب نہ ہو سکے" اس خیال کی تائید اور کوششوں میں ناکامیوں کی مثالیں قدیم دورِ تاریخ سے لے کر حالیہ تاریخ تک سے دی جا سکتی ہیں۔

مولانا مرحوم کے یہ جملے قابلِ غور معلوم ہوتے ہیں کہ اسلام متحد کرنے میں ناکام رہا، لہٰذا اگر مناسب سمجھیں اور گنجایش ہو تو "صدق" کی کسی اشاعت میں جواب مرحمت فرمادیں تاکہ میرے جیسے قارئین کا خلجان دور ہو جائے۔ احقر عبداللہ سورتی۔ سعادت منزل۔ دیوبند

(یکم دسمبر ۱۹۶۱ء)

مولانا ابوالکلام پر "نوک جھونک":

مولانا آزاد پر دریابادی کی نثری تحریر کے حوالے سے کہ آپ ان کے بارے میں اتنی نوک جھونک کیوں کرتے ہیں؟

ناظرین زحمت گوارا کر کے ایک نظر اصل تحریر پر پھر ڈال لیں۔ صدق ع۱۲ مورخہ ۱۱ر فروری ہیں، اور اس کے بعد فرمائیں کہ ان کا کیا ارشاد ہے؟ ..... زمین پر ہر بسنے والے کے لیے حکیم مطلق نے کیسے کیسے تجربوں سے گزرنا رکھ دیا ہے۔

(ایک مراسلے کے جواب میں، ۱۸ر مارچ ۱۹۶۳ء)

بسترِ مرگ پر:

"انسانیت موت کے دروازے پر" کی نسبت حکیم نسیم آثمی (بمبئی) کے ایک مراسلے کے جواب میں:

مشہور و مقبول اربابِ قلم کی یہ بدقسمتی ہے کہ ناشرین ان کے نام اور شہرت سے فائدہ اٹھانے کے لیے کیسی کیسی، بلکہ ایسی ویسی تحریریں ان کی جانب بے تکلف منسوب کر دیتے ہیں۔ (۲ر اگست ۱۹۶۳ء)

ترجمہ قرآن منسوب بہ شیخ سعدی:

اتنا تو اچھی طرح یاد ہے کہ مولانا ابوالکلام بھی اس ترجمے کی نسبت شیخ سعدی کی جانب بالکل غلط سمجھتے تھے۔ اور خیال یہ ظاہر کرتے تھے کہ کسی نے اصل مترجم کے نام کے ساتھ تعظیمی لقب "مصلح الدین" دیکھ کر اس کو شیخ سعدی کا ترجمہ سمجھ لیا ..... یہ بات مولانا نے ایک مختصر مجلس میں فرمائی تھی۔

رہا یہ کہ انھوں نے بھی اس کی صحیح نسبت سید شریف جرجانی کی جانب قرار دی تھی، سو

یہ پوری طرح یاد نہیں پڑتا۔ اطمینان اس میں ہے کہ یہ بات بھی مولانا ابو الکلام نے فرمائی تھی یا کسی اور نے لکھی، بہر حال کسی اہل علم ہی کی زبان سے نکلی ہوئی کان میں پڑی ہوئی ہے، اور اس کے کہنے والے مولانا عبد الشکور صاحب ہی نہ تھے۔ مولانا عبد الشکور اور مولانا ابو الکلام دونوں کی نظر ایسے معاملات میں تھی اچھی اور گہری۔ (۲۰ دسمبر ۱۹۶۳ء)

وحدت ادیان

صدق بابت ۱۵ر نومبر کے شمارے میں آپ کا نوٹ اکبر کے نقش قدم پر نظر سے گزرا۔ آپ نے جو تحریر فرمایا ہے کہ بے شک یہ وحدت ادیان کا فتنہ بھی وقت کے سخت ترین فتنوں میں سے ہے۔ اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ آپ نے یہ حقیقت واضح کر کے بہتوں کو گمراہ ہونے سے بچا لیا۔ لیکن اس سلسلہ میں جو بات میرے دل میں بری طرح کھٹک رہی ہے وہ یہ ہے کہ اس تحریک وحدت ادیان کے ایک اہم مبلغ امام الہند مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم و مغفور کو آپ نے بڑی خوبصورتی سے نظر انداز کر دیا، حالانکہ مولانا نے اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور سورہ فاتحہ کی تفسیر میں اس فلسفہ کا پرچار بڑی شدت سے کیا۔

چنانچہ ہندوستان کے مشہور اسلامی قانون داں جناب آصف علی فیضی نے اپنی کتاب Modern Approach To Islam میں وحدت ادیان کے اس فلسفہ کی مولانا آزاد کے حوالے سے مدح سرائی فرمائی ہے۔

آپ نے جو اس خوبی کے ساتھ مولانا کے ذکر کو نظر انداز کر دیا ہے کہیں اس لیے تو نہیں ہے کہ

خطائے بزرگاں گرفتن خطا است

ایم۔ ایچ۔ جوہری۔ از ماہم بمبئی ۱۶

صدق۔ یقین نہیں آتا کہ مولانا مرحوم اس تمام تر غلط اور چلے ہوئے مفہوم میں وحدت ادیان

کے قائل ہوں۔ مراد ان کی صرف یہ ہوگی کہ اصل جوہر کے اعتبار سے سب مذہب ایک رہے ہوں گے نہ یہ کہ سب مذہب جیسے کہ وہ اب ہیں یکساں ہیں دونوں کے درمیان فرق زمین و آسمان کا ہے۔ بہر حال وہ جو صاحب بھی ہوں، دیکھنے کی چیز قول باطل ہے، نہ کہ قائل کی شخصیت۔

(۲۷ر دسمبر ۱۹۶۸ء)

سلہ مولانا دریا بادی نے بالکل صحیح فرمایا، مولانا آزاد کا مفہوم یہی ہے کہ اسلام سے قبل جو بھی آسمانی مذاہب تھے، ان کی تعلیم اپنی اصل کے لحاظ سے ایک تھی، نہ کہ موجودہ صورت میں بشمول مذاہب بعد از ظہورِ اسلام بھی ایک ہیں، آصف علی فیضی کا عقیدہ کیا تھا اور انھوں نے مولانا آزاد کے حوالے سے کیا لکھا، اس کے ذمے دار وہ خود ہیں، مولانا کی عبارت کا اگر یہ جو مفہوم انھوں نے لیا ہے (بہ قولِ مراسلہ نگار) تو اس خیال کی تردید حضرت مولانا خود فرما چکے ہیں۔ دیکھیے "تیرا عقیدہ"

مشاہدات و تاثرات

مشاہداتِ کلکتہ

(۱)

شہر اپنا دیکھا ہوا تھا۔ شہر پہلی بار دیکھنے میں آیا۔ دعوے دونوں متضاد مگر دونوں اپنی اپنی جگہ صحیح —— پہلا دعویٰ صحیح یوں کہ یہ دیکھنا ۱۹۱۳ء میں ہوا تھا۔ جب اپنی نوجوانی اور یونیورسٹی کی طالب علمی کا زمانہ تھا۔ کامریڈ تو اس وقت تک دہلی منتقل ہو آیا تھا۔ لیکن مولانا ابوالکلام کا الہلال ہر ہفتہ طلوع ہو رہا تھا۔ بلکہ اپنے شبابِ شہرت کے لحاظ سے بدرِ کامل بنا ہوا تھا۔ مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبداللہ عمادی، آغا رفیق بلند شہری۔ آہ کہ آج سب مرحوم ہیں، اس وقت اس کے اسٹاف کی زینت بنے ہوئے تھے۔ اپنا قیام بھی مولانا کی عنایت سے یہیں ہوا تھا۔ آغا صاحب تو اپنے لیے ذرا اجنبی سے تھے باقی ان تینوں یارانِ باصفا نے تو جیسے وطن کی یاد ہی دل سے بھلا دی تھی —— دوسرا دعویٰ صحیح یوں کہ جس نوجوان عبدالماجد نے یہ سفر کیا تھا وہ اب بجز نام کے اس دنیا میں زندہ ہی کہاں ؟ ۴۰، ۴۲ سال کی مدت کوئی معمولی مدت ہوئی ؟ دنیا کیا سے کیا ہو گئی۔ اور خیر کلکتہ تو وہ کیا رہتا۔ اس کا دیکھنے والا ہی وہ نہ رہ گیا۔ اور نہ اس کے دیکھنے والے کی نظر ہی وہ رہ سکی۔ تو اگر قلم سے یہ نکل گیا کہ کلکتہ پہلی بار دیکھنے میں آیا تو شاید کوئی ایسی غلط بیانی تو نہ ہوئی !

(۱۶ ستمبر ۱۹۵۵ء)

(۲)

جب اور سن آیا تو اسٹیٹسمین، انگلش مین، امپائر، بنگالی، پتریکا کا شور و شغب کانوں تک پہنچنے لگا اور کالج کے زمانہ میں محمد علی جوہر کے کامریڈ اور ابوالکلام کے الہلال نے قبضہ

دل و دماغ دونوں پر چھایا تھا۔ پھر ایک زمانہ وہ بھی آیا۔ جب یہاں کے مسلمانوں نے ایک انگریزی اخبار کی بدتمیزی سے مشتعل ہو کر ناموس رسول کی خاطر اپنے کو کٹنے مرنے کے لیے بے تکلف پیش کر دیا۔ یہ وقت وہ تھا (۱۹۱۸ء میں) کہ ابوالکلام اور محمد علی دونوں نظربند یا قید تھے۔

(۲۳ ستمبر ۱۹۵۵ء)

سیرِ دہلی

(۱)

نئی دہلی کی کوٹھی جس میں قیام ہوا۔ اب اس میں بہت کچھ اضافہ ہو گیا ہے۔ یہ ایک زمانہ میں رفیع قدوائی مرحوم کی تھی، یہیں ایک بار آکر ان سے ملا تھا۔ اور ایک بار آکر یہاں کھانا کھایا تھا۔ قدم رکھتے ہی ان کی ایک ایک بات یاد آگئی۔ سرکاری حلقوں میں اور انتظامی حیثیت سے جو شہرت انھوں نے مستعدی، کارگزاری، دیانت، فرض شناسی کی پائی۔ اور جس طرح مسلمان وزراء کی وقعت بڑھائی یہ تو انہیں کا حصہ تھا، باقی ذاتی حیثیت تو ان کی مہمان نوازی، فیاضی اور جذبۂ خدمت خلق، بھولنے والی چیز ہی نہیں، اور پورا مہمان خانہ وہاں قائم تھا۔ گویا ایک مستقل لنگر جاری! ــــ جس سڑک پر یہ کوٹھی نمبر ۶ واقع ہے۔ اس کا نام پہلے تھا۔ کنگ اڈورڈ روڈ اور اب ہے۔ مولانا آزاد روڈ، سڑک کی تختی پر یک بیک نظر پڑی، اپنے ساتھ مولانا کی خوش گوار یادوں کو بھی تازہ کر گئی ــــ فراخ دلی، رواداری، علم و تحمل میں اپنی نظیر آپ تھے۔ ان سے بھی ان کے زمانۂ وزارت میں ملاقاتیں ایک سے زائد بار ہوئی تھیں، اور ان کی میزبانی کا لطف بھی اٹھایا تھا، اپنے تدبر، نکتہ رسی و فراست کا قائل گاندھی جی اور جواہر لال تک کو کر لیا تھا۔ سردار پٹیل تک کو ان کا لوہا ماننے پر مجبور ہونا پڑا تھا۔ اور مسلمانوں کو ان کی زندگی تک یہ خیالی اطمینان رہا، کہ کانگریس اور حکمراں جماعت میں ایک آدمی تو ہمارا موجود ہے! ــــ

(۶ ستمبر ۱۹۶۳ء)

(۲)

نیشنل آرکائیوز (قومی محافظ خانہ) دہلی ..... وزیر تعلیمات ہند مولانا ابوالکلام کی توجہ نے اس میں اور چار چاند لگا دیے۔

(۱۳ر ستمبر ۱۹۶۲ء)

سفرِ دکن

آزادی ری سرچ انسٹی ٹیوٹ، حیدرآباد (دکن):

اسی ادارے (ادارہ ادبیاتِ اُردو) کے ایک گوشے میں مولانا ابوالکلام کی یادگار میں آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ہے۔ اور اس ادارے کے دو سرگرم کارکن پروفیسر علی اکبر اور پروفیسر عبدالمجید صدیقی ہیں۔ دونوں صاحبِ قلم اردو ہی کے نہیں انگریزی کے بھی۔ صدیقی صاحب تاریخ کے استاد رہ چکے ہیں۔ اور معلوم ہوا کہ ادارہ کے ارکان انتظامی میں کئی ہندو صاحبان بھی شریک ہیں۔

(سفرِ دکن (۳) ۱۷ر جنوری ۱۹۶۴ء)

دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدرآباد دکن:

یاروں نے کیا کوئی کسر ادارہ کے بند کرا دینے کی اٹھا رکھی تھی۔ ادارہ مسلمانوں کا مخصوص کام کر رہا ہے۔ "فرقہ وارانہ" ہے۔ سیکولر حکومت میں اس کا کیا کام۔ اسے فوراً القط ہونا چاہیے، قریب تھا کہ فرمان قضا توامان اسی مضمون کا شائع ہو جائے اور حکومت آندھرا پردیش کے حکم سے ادارہ کے دروازوں میں قفل پڑ جائیں۔ لیکن حافظ حقیقی کو کچھ اور ہی منظور تھا، وزیر تعلیم سرکار ہند، مولانا ابوالکلام (کہ اللہ انہیں غریقِ رحمت فرمائے) کہ انھوں نے اپنے منصب عالی کی کرسی سے زبردست احتجاج نامہ بھیجا کہ بند ہونا کیا معنی ایسے ادارہ کو قائم ہی نہیں اور ترقی دینا چاہیے۔ بیرون ہند کی پڑھی لکھی دنیا میں تو سرکار ہند کی سیکولرازم کا بھرم ہی اس سے قائم ہے۔ اپنے سرکاری دورہ میں یورپ نے کیا جرمنی

اور کیا فرانس، کیا برطانیہ اور کیا اٹلی، سب کہیں کے اہل علم کو اس کی خیریت دریافت کرتے اور اس کے کارناموں کے راگ گاتے ہوئے پایا۔" جب کہیں جا کر ادارہ کی جان بخشی ہوئی۔ اور آرزو اُن لوگوں کی پوری نہ ہونے پائی جو علم و فن سے تعصب رکھنے والے اور حقیقۃً سرکار ہند کی نیکنامی کے دشمن ہیں!

(سفر دکن (۴) ۲۴ر جنوری ۱۹۶۴ء)

معائنہ دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدرآباد (دکن):

خدا غریق رحمت کرے وزیر تعلیمات ہند مولانا ابوالکلام آزاد کو کہ ان کی مسیحانفسی نے اسے ازسرنو زندگی عطا کی۔

(۱۷ر جنوری ۱۹۶۴ء)

شخصیات

علامہ شبلی

مکان کئی بدلے، پہلے دار العلوم ندوہ ہی کی عمارت میں محلہ ماموں بھانجے کی قبر میں رہتے تھے، پھر گوئن روڈ پر بھیروں جی روڈ اور گوئن روڈ کے گولا گنجی سرے کے درمیان ایک بڑے وسیع ولق و دق مکان میں اُٹھ آئے، باضابطہ نیاز پہلی بار یہیں حاصل ہوا، پھر مرزا حیدر مرزا روڈ پر جہاں اس وقت آریہ سماجی پریس ہے۔ اس کے متصل ایک مکان میں جو نسبتاً چھوٹا مگر ایک آدمی کے لیے پھر بھی بہت بڑا تھا منتقل ہو گئے۔ یہ شروع ۱۹۱۰ء ہوگا۔ مولانا ابوالکلام بھی ایک بار میری یاد میں یہاں آکر رہے تھے۔ اس وقت ان کا شمار مولانا کے خوردوں میں تھا۔ مولانا انہیں "آزاد" کہہ کر آواز دیتے تھے۔ تین ہی سال بعد ۱۲ء میں الہلال نکل آیا تو بزرگی خوردی کی یہ نسبت مساوات میں تبدیل ہو گئی۔ آزاد اب بھی کبھی کبھی لکھنؤ آتے اور مولانا ہی کے پاس ٹھہرتے رہے، مولانا اب امین آباد پارک (گھنٹہ گھر پارک) میں اُٹھ آئے تھے، یہ نیا نیا بن کر تیار ہوا تھا اور بہت ہی پُر فضا تھا، قیام اس کے بالاخانہ ۵۳ پر تھا، ایک پنجرے میں لال پلے ہوئے تھے، اور پنجرا سامنے ٹنگا رہتا تھا، اس گستاخ نے پہلی حاضری پر قدم رکھتے ہی کہاں "ہاں اب یہ مصنف شعر العجم کا گھر معلوم ہوتا ہے"۔۔۔ سالہا سال بعد تک اس بالاخانے کے ساتھ مولانا کی یاد وابستہ رہی، لکھنؤ میں مولانا کا آخری مسکن یہی تھا۔

(۲۸ اکتوبر ۱۹۶۰ء)

سید سلیمان: ایڈیٹر کی حیثیت سے

مولانا ابوالکلام آزاد سید صاحب کے جوہر شناس شروع ہی سے تھے۔ ادھر وہ الندوہ سے سبکدوش ہوئے، ادھر مولانا ابوالکلام نے انہیں کلکتہ اپنے ہفتہ وار الہلال کے لیے

کھینچنا شروع کیا۔ الہلال (کلکتہ) میں خاص اس مذاق کے شخص عبداللہ عمادی موجود ہی تھے، پھر بھی سید صاحب کی بات ہی کچھ اور تھی، سید صاحب جب الہلال میں پہنچے ہیں تو نام کا تو یہ اب بھی 'ہلال' ہی رہا لیکن اہل بصیرت دیکھ رہے تھے کہ ہلال بدر بن گیا ہے اور اس کی نور افشانی کلکتہ کے مطلع سے شروع ہو کر مشرق و مغرب، شمال و جنوب، سب کو مطلع انوار بنا رہی ہے، خود عربی لے قدیم و جدید دونوں طرح کے ماخذوں کی مدد سے مسلمانوں کے لیے دینی، تمدنی، سیاسی، تاریخی ہر عنوان سے متعلق بہترین معلومات پیش کرنا، یہ کام تو سید صاحب کا تھا ہی باقی خود ہندوستان کی سیاسیات حاضرہ پر مقالہ لکھنے میں سید صاحب اپنے چیف ایڈیٹر سے پیچھے نہ رہے۔ افسوس کہ الہلال کی فائلیں اس وقت ناپید ہیں (ہمارے ہاں کی جلدیں ایک خائن ملازم نے ردی کے لالچ میں بیچ ڈالیں) ورنہ موقع تھا کہ سید صاحب کی الہلالی تحریروں کے بعض اقتباسات جوں کے توں دے دیے جاتے۔ اس وقت کہنا صرف یہ ہے کہ مولانا شبلی اور مولانا ابوالکلام دونوں اگرچہ اپنے اپنے رنگ میں اردو ادب کے لیے باعث ناز ہیں لیکن بڑا فرق دونوں کے رنگ میں ہے۔ شبلی کے ہاں یہ احتیاط اور رکھ رکھاؤ کہ بلا ضرورت دو لفظ بھی قلم سے نہ ٹپکیں، اور ہر تکرار کا حشو و زائد میں شمار، پھر تشبیہ اور استعارے اگر ہلکے پھلکے قسم کے کبھی دبے پاؤں آبھی جائیں تو بس ایسے کہ سلاست کلام میں ذرا بھی مخل نہ ہوں، ابوالکلام کے ہاں وہ فیاضی کہ نئی نئی تشبیہیں اور حسین و جمیل استعارے جیسے ابلے پڑتے ہیں اور الفاظ کی تکرار و مترادفات کا وہ ریلا کہ پڑھنے والا ان میں گم ہو کر رہ جائے۔ سید صاحب کے اسلوب بیان میں اگرچہ انفرادیت شروع ہی سے تھی اور وہ مقلد محض کسی کے بھی نہ تھے، پھر بھی مولانا شبلی کا رنگ ان پر اچھا خاصہ چھایا ہوا اور شبلیت قدرتاً ان کے قلم کا ایک جزو اس وقت تک بن چکی تھی۔ لیکن اب جب وہ الہلال میں آئے تو گویا دوسرے ابوالکلام بن گئے، ان کے رنگ میں اس طرح ڈوب کر اور اس درجہ ان کے ہم رنگ ہو کر لکھنا شروع کیا کہ اچھے اچھے اہل نظر کو بھی امتیاز دشوار ہو گیا، اور سماں من تو شدم تو من شدی، کا بندھ گیا۔ ابوالکلام کے طرز بیان کی تقلید آسان نہیں بڑے بڑوں نے جب اس روش پر چلنا چاہا تو راہ میں پیر پھسل گئے ہیں۔ یہ کمال سید صاحب

ہی کا تھا کہ شبلیت سے جب چاہا الگ ہوکر ابوالکلامیت اختیار کرلی، اور پھر اس رنگ کو بھی جب چھوڑنا چاہا اوراق دہر پر نقش سلیمانی کی مہر لگاکر دکھادی ــــ ۱۹۱۳ء میں جب کانپور کی ایک مسجد کے غسل خانے کا سرکاری حکم سے گرانے کا ہنگامہ پیش آیا ہے، اور پولیس کی گولیوں سے کچھ مسلمانوں کی جانیں گئی ہیں، اس وقت الہلال میں ایک بڑے طنطنہ کا مقالہ افتتاحیہ مشہدِ اکبر کے عنوان سے نکلا تھا، جس نے نہ معلوم کتنوں کو سسکیوں بھرے غم کے ساتھ رلایا اور کتنوں کو غیظ و غضب کے جوش کے ساتھ المکایا، اسے آج بھی اٹھا کر دیکھیے کہیں سے پتہ بھی نہ چلنے پائے گا کہ یہ مضمون ابوالکلام کے نہیں ان کے ادبی ہم زاد کے قلم کا ہے! ایسد مرحوم داستان بزم کے تو بادشاہ تھے بہ قول شخصے ع

ہے قلم میرا ابر گوہر بار

لیکن جب رزمیہ لکھنے پر آتے جب بھی ان کی شخصیت زبان حال سے پکار اٹھتی ع

ہے زباں میری تیغ جوہر دار

(۲۲ر جنوری ۱۹۵۴ء)

شورش کاشمیری

دعوتوں اور پارٹیوں کا سلسلہ وسیع بھی تھا اور طویل بھی - اب سب یاد بھی کسے، لیکن دو چار تو ایسی ہیں، جو کسی حال میں بھولنے والی نہیں، ان میں سے ایک شورش صاحب، چٹان والوں کے ہاں تھی - نام مدت سے کان میں پڑا ہوا تھا، چٹان کی زیارت بھی ہر ہفتہ ہوتی رہتی تھی، ملے تو سراپا باغ و بہار نکلے، چٹان کی صلابت کے بجائے مہر و وفا کے پتلے - تقریر و خطابت کا رنگ تحریر تک میں غالب ہوتا ہے، تو پھر گفتگو تو اس رنگ کی ہونا ہی تھی، پرچہ اور گفتگو دونوں سے سوشلسٹ قسم کے مسلمان نظر آتے ہیں، لیکن کھانے کی میز نوابوں، سرمایہ داروں، جاگیرداروں کے رنگ کی، ابھی جوانی ہی کی آخری منزلوں میں ہیں، لیکن اتنے ہی سن میں دس سال سے اوپر کی مدت جیل میں کاٹے ہوئے، خدا نہ کرے کہ اب کبھی جیل خانے کی نوبت آئے، اور نہ وہ خود اب کبھی اپنے کو جیل کے لیے پیش کریں۔ ولایتی حکومت میں جیل خانے کے معنی کچھ اور تھے، اور اب اپنی حکومت میں اس کے

معنی کچھ اور ہیں، اَشِدَّاءُ عَلَی الْکُفَّارِ ہونا جس طرح ایک رنگ عبادت کا ہے، اسی طرح رُحَمَاءُ بَیْنَھُمْ کی شان بھی امتثال امر اور تکمیل عبدیت ہی کی ہے۔

(ڈھائی ہفتے پاکستان میں (۵) صدق جدید۔ ۳ جون ۵۵ء)

مولانا غلام رسول مہر

سرگزشت مجاہدین، ۱۸۵۷ء کے مجاہدین اور ۱۸۵۷ء مولانا غلام رسول مہر مرحوم کی تاریخی تصنیفات ہیں۔ ان پر تبصرہ کرتے ہوئے چند سطریں ان کے اسلوبِ نگارش اور حضرت مولانا آزادؒ کے طرزِ تحریر سے مماثلت پر بھی نکل گئیں، یہ سطریں ہدیۂ قارئین ہیں:-

"مہر صاحب کا انداز بیان بڑا پختہ و سنجیدہ ہے، اور وہ مولانا ابوالکلام کے مکتبِ نگارش کے بڑے کامیاب شاگردوں میں ہیں، بلکہ لفظ شاگرد لانا ان کے مرتبۂ استادی کو مجروح کرتا ہے، وہ اپنا ایک مستقل اسلوب بیان رکھتے ہیں۔ اور فارسی اشعار کے برمحل تصرف میں تو کہنا چاہیے کہ خود مولانا ابوالکلام کی ٹکر کے ہیں، کتابیں تاریخی اعتبار سے جیسی بھی ہوں، بہر حال ادب و انشاء کے پہلو سے اپنا ایک خاص وزن اور مستقل مقام رکھتی ہیں"

(۲۹ نومبر ۱۹۵۷ء)

اُردو کے چند مظلوم ادیب

اس مضمون میں بیسیوں ادیبوں کی مظلومیت کا ذکر آیا تھا، لیکن ہمارا مقصود صرف مولانا آزاد کا ذکر ہے، چند سطریں مزید آگئی ہیں۔

شہرت اور کمالِ فن مترادف نہیں کتنے طبیب حاذق شہرت عام سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اور کتنے ہی "نام آور" طبیب حذاقت فن سے کورے نکل جاتے ہیں، اور اک طب پہ موقوف نہیں، شعرادب، صحافت، وکالت، ہر علم، فن اور پیشہ میں یہی حال نظر آتا ہے، اس وقت اردو کے چند ایسے ادیبوں کے نام گنائے جاتے ہیں، جنہیں شہرت کا وہ مرتبہ حاصل نہ ہو سکا۔ جس کے وہ ہر طرح مستحق اپنے کمال فن کے لحاظ سے تھے —— غیر معروف رہ جانے کے اسباب متعدد ہو سکتے ہیں، اور ہوتے ہیں۔ یہاں مقصود ان اسباب کی تشخیص اور ان کا تجزیہ نہیں۔ بلکہ نفس واقعہ یعنی ان ادیبوں کی غیر معروفیت بلکہ مظلومیت کا ذکر کر دینا ہے۔

ان مظلوموں میں نمبر اول مولانا ابوالکلام آزاد ہیں۔ مولانا کی نفس شہرت میں کلام نہیں ان کی شخصیت اتنی زبردست تھی کہ اس نے ملک و ملت کے گوشہ گوشہ پر اثر ڈالا ہے اور ہندوستان کی دنیا ان کے نام کی آواز سے گونج رہی ہے، سوال ان کی عمومی شہرت کا نہیں، ان کی ادبی شہرت کا ہے —— تاریخ ادب اردو میں اب تک خدا معلوم چھوٹی بڑی کتنی کتابیں لکھی جا چکی ہیں، ان میں سے کتنوں میں ان کے ادبی مرتبہ کا ذکر ہے؟ اسے بھی جانے دیجئے، ان کا نام نامی ہی کتنی کتابوں میں آیا ہے؟ ان کی کتابیں، سرکاری و خانگی و ملکی و ملی، کتنی درسگاہوں کے ادبی نصاب میں داخل ہیں؟ کتنوں کو اس کا علم ہے کہ ان کی تحریریں اردو ادب و انشاء کے بہترین نمونوں کا کام دے سکتی ہیں؟ کتنے اس سے باخبر ہیں کہ مولانا کی سیاسی سربلندیوں اور مذہبی عظمتوں میں ایک بڑی حد تک دخل مولانا کے ادب و

انشاء کو بھی رہا ہے! کتنوں کی رسائی اس حقیقت تک ہے کہ موافقین ہی نہیں، مولانا کے مخالف بھی ان کے کمال انشاء کے قائل و معترف اور ان کے زورِ قلم سے متاثر رہے ہیں؟ بہتوں کے کان میں یہ بھنک بھی نہیں پہنچی کہ مولانا کی نظر، زبان، خصوصاً زبانِ دہلی کے کن کن گوشوں اور باریکیوں پر تھی اور انھیں زبان کے محاورات و تلمیحات پر کس درجہ کا عبور حاصل تھا!

مولانا ابوالکلام کے نام کے ساتھ ہی یاد دہلی کے ایک دوسرے مظلوم ادیب خواجہ حسن نظامی کی آجاتی ہے۔ ان کے قلم میں آزاد کی سی عظمت و بلندی نہ تھی، لیکن سلاست اور دل نشینی درد و گداز ترنم و شیرینی تاثیر و کشش میں خواجہ صاحب کسی سے نیچے اور کسی سے پیچھے نہ تھے۔ ابوالکلام اگر خواص کے ادیب تھے، تو خواجہ صاحب عوام کے اور دہلی کی مستند اور ٹکسالی زبان پر عبور میں بھی یہ اپنی نظیر آپ تھے۔ عام اردو داں طبقہ کے سکھانے، پڑھانے، اسے مہذب و شائستہ بنانے، اسے ادب قاعدہ سے لگانے میں جو حصۂ عظیم خواجہ صاحب کا رہا ہے، وہ ہر ایک کے بس کی بات نہ تھی، اور کسی ایک انسان کے لیے بھی باعث فخر ہو سکتا ہے، رنج کی بات ہے کہ ایسے محسن اردو کو اس درجہ بھلا دیا گیا! اور بھلا کیا دیا گیا، انھیں اردو ادب کے تاریخ نویسوں نے یاد ہی کب رکھا تھا! کسی تاریخ ادب میں غریب کا نام تک بھی شاید نہیں آنے پایا ہے۔

(چٹان، لاہور۔ ۱۷ ستمبر ۱۹۶۳ء)

چند مظلوم شخصیتیں

زندگی بھر میں حق ادا کسی کے بھی کر پایا ہوں، بڑوں، چھوٹوں، برابر والوں میں شرمندگی نہیں، کس سے ہے؛ صفات ستاری وغفاری اگر آڑے نہ آجائیں تو حشر میں آنکھیں چار کرکے سامنا کسی ایک بھی سابقہ والے کا نہیں کر سکتا، پھر بھی چند ہستیاں تو خصوصیت سے ایسی ہوئی ہیں، جن کے معاملہ میں حق تلفی اتنی نمایاں اور سنگین رہی ہے کہ جب ان کی یاد آجاتی ہے تو جسم میں جھرجھری سی آنے لگتی ہے، اور آنکھیں فرطِ ندامت سے زمین پر گڑ کر رہ جاتی ہیں۔ احاطہ اور استقصاء اپنے ایسے مظلوموں کا کہاں کر سکتا ہوں، یہی غنیمت ہے کہ دو چار نام حافظہ میں ناقابل محو ہونے کی حد تک ثبت ہو چکے ہیں، سب سے پہلا شکار اس بدبخت کی خیرہ سری کا تو خود والد ماجد مرحوم رہے۔ میں بیس[۲] سال کا ہو چکا ہوں ۱۲ سنہ ء میں ان کی وفات ہوئی، اور گریجویٹ ہو چکا تھا، مضمون نگاری میں خاصہ نام پیدا کر چکا تھا۔ غرض ذمہ دار زندگی پوری طرح شروع کر چکا تھا، لیکن والد ماجد کی خدمت واطاعت کی طرف سے آنکھیں کم بخت بند کی بند ہی رہیں۔

پندرہ، سولہ سال کے سن تک تو حال غنیمت رہا، اور عام انگریزی خواں نوجوانوں کی طرح لشتم پشتم گزر ہوتا گیا۔ سولہ، سترہ برس کے سن سے، جب سے "عقلیت" "آزادی" وآزاد خیالی کا سودا سر میں سمایا، معمولی بزرگ داشت بھی طبیعت پر بار ہونے لگی۔ نماز، روزہ سب چھوٹا، یہی ان کی تکلیف اور سوہان روح کے لیے کیا کم تھا کہ براہ راست نافرمانیاں بھی شروع کر دیں، تفصیلات درج کرنے سے کچھ نہ حاصل نہ ناظرین کا کوئی نفع، خلاصہ یہ کہ عمر کے آخری ڈھائی تین سال مجھ نالائق کی طرف سے تکلیف ہی میں گزرے۔ رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۔

بزرگ، دوستوں بلکہ محسنوں میں بھی کم سے کم تین شخص تو ضرور ایسے گزرے ہیں، جن

کے حقوق کسی درجہ میں بھی ادا نہیں ہوئے، بلکہ انھیں اذیت ہی پہنچتی رہی ——

ان میں سے ایک علی گڑھ کے رکن رکین اور بعد کو یونیورسٹی کے وائس چانسلر صاحبزادہ آفتاب احمد خاں ہیں، بچارے نے ہمیشہ میرے اوپر لطف و عنایت کی نظر رکھی، مجھے اس وقت بلاکر اپنے ہاں ملازمت دی، جب میرا کوئی پوچھنے والا نہ تھا، اور افسر و ماتحت کے بجائے برتاؤ بھی مجھ سے بالکل مساویانہ رکھا، میں نے ان کے اخلاص کی کچھ قدر نہ کی اور میری طرف سے انھیں گوناگوں تکلیفیں ہی پہنچتی رہیں۔ آج جب اپنی طوطا چشمی کا خیال آتا ہے تو شرم سے کٹ جاتا ہوں، لیکن ان کے حلم و شرافت سے توقع یہی ہے کہ حشر میں بھی وہ بجائے انتقام کے عفو و درگزر ہی سے کام لیں گے ——

دوسرا نام فرنگی محل کے مشہور عالم اور صاحب طریقت مولانا قیام الدین عبدالباری (متوفی ۱۹۲۶ء) کا ذہن میں آتا ہے۔ ان کی طرف سے برتاؤ مجھ سے ہمیشہ شفقت و عنایت کا ہی رہا، میں اپنی نادانی و کج فہمی سے ان کے مخالفین کے کہنے سننے میں آگیا، اور جو طریقے انھوں نے مولانا کی تضحیک و تفضیح کے اختیار کیے ان میں ان کا مشیر بلکہ آلہ کار بنا رہا، مولانا بڑے صاحب حوصلہ و عالی ظرف تھے، یقین ہے کہ حشر میں بھی وہ اپنے اس نالائق خُرد کے مقابلہ میں اسی کا ثبوت دیں گے۔

تیسرا نام اگرچہ ان دونوں سے کم درجہ پر اسی سلسلہ میں مولانا ابوالکلام آزاد (ایڈیٹر الہلال) کا ہے، ان کی اذیت و دلآزاری میں میں نے سنہ ۱۲ء، ۱۳ء میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ ان تینوں صورتوں میں ہر بار یہی ہوا کہ میں دوسروں کی روایتوں کے بھروسے پر رہا، اور خواہ مخواہ اتنی بدگمانیاں قائم کرلیں، ورنہ بالذات مجھے تینوں میں سے کسی صاحب سے بھی شکایت نہ تھی۔

(آپ بیتی (باب ۴۶) لکھنؤ، ۱۹۷۸ء)

کتنا غلط یہ حرف بھی مشہور ہو گیا

بعض مہربانوں اور مولانا ابوالکلام مرحوم و مغفور کے نادان دوستوں نے واللہ اعلم کہاں سے یہ روایت پھیلا دی ہے کہ مجھے مولانا سے مخالفت بلکہ ایک طرح کا بغض و عناد رہا ہے۔ اور حیرت ہے کہ اس رو میں بہہ کر بعض سادہ دل مخلصین بھی اس پر کچھ یقین سا کرنے لگے۔ بلکہ ایک آدھ ظالم نے تو دبی زبان یہاں تک لکھ دیا کہ میں مولانا کی مغفوریت تک کا قائل نہیں!——معاذ اللہ! بدگمانی کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ میں تو کسی عاصی اور فاسق مسلمان کے لیے بھی عدم مغفوریت کا تصور نہیں کر سکتا۔

چہ جائیکہ ایک صاحب علم و فضل اور مفسر قرآن کے لیے! اس اتہام کے محرکات جو کچھ بھی ہوں۔ اتہام بہرحال اتہام ہی ہے، مولانا کا میں مدۃ العمر نیازمند رہا۔ انھیں ایک محترم عنایت فرما سمجھتا رہا، بلکہ آخر میں تو مولانا کا شمار میرے محسنوں میں تھا۔

رہا فلاں دینی، علمی، سیاسی مسئلہ میں اختلاف، تو وہ کس خرد کو اپنے بزرگوں سے کس شاگرد کو اپنے استادوں سے، کس متاخر کو متقدموں سے نہیں ہوتے؟——مبالغہ پسندی اور غلو ہماری قومی سیرت کا جزو بن چکے ہیں۔ ادھر چند سال کے اندر بار بار تجربہ اس کا ہوا، کہ جس کسی عالم، لیڈر، شاعر، ادیب کے درجہ مدح میں ساتھ اس مرحوم کے غالی پرستاروں کا نہ دے سکا۔ اس حلقہ میں مجھے اس کا منکر یا مخالف ہی ٹھہرا لیا گیا! ہیرو پرستی بھی اجتماعی زندگی میں ایک مقام رکھتی ہے۔ لیکن آخر اس کے بھی کچھ حدود و آداب ہیں۔

جس چابک دستی کے ساتھ ایک مہربان نے میرے نام مولانا کا خط جنت سے گڑھ لیا ہے[1]۔ اگر افسانہ نگاری پر قدرت رکھتا تو خود بھی طبع آزمائی کرتا، اور اس کا جواب بھی مولانا ہی کے قلم سے جنت سے منگا دیتا!

(۱۸ مارچ ۱۹۶۰ء)

---

[1] اشارہ شورش کاشمیری کے خط کی طرف ہے۔

میٹرک پاس کرکے (جون ۱۹۰۸ء) تک اپنا بھی یہی رنگ ماحول کی تقلید میں رہا، کالج میں آنے اور لکھنؤ میں قیام کے بعد جب "آزادی" کی ہوا لگی، تو اپنے خیالات بھی بدلنے اور کانگریس کی طرف مائل ہونے لگے، چنانچہ ۱۹۱۲ء میں کلکتہ سے الہلال مولانا ابوالکلام کی ایڈیٹری میں بڑے آب و تاب اور اہتمام خصوصی کے ساتھ نکلا، میں اس سے کچھ زیادہ متاثر نہ ہوا، بلکہ ان کے مخالفین ہی کے گروہ میں شامل رہا، اس وقت تک اپنے "پندارِ علم" میں مبتلا تھا، اور ان کے علم و فضل کا قائل تھا نہیں۔ اس وقت تک انھیں محض ایک پرجوش خطیب سمجھے ہوئے تھا۔

(آپ بیتی ص ۲۶۱)

○

ستمبر ۴۸ء میں سلطنت آصفیہ کا قلع قمع ہوگیا، اور لپیٹ میں میری پنشن بھی آگئی، اکتوبر ۵۰ء میں حکم آیا کہ پنشن بند! دہلی سے مولانا ابوالکلام آزاد وزیر تعلیمات ہند نے میری حمایت میں بڑا زور لگایا، اور بار بار اجرا پنشن کے لیے لکھا، کامیابی نہ ہوئی، آخر میں دہلی جاکر پنڈت جواہر لال نہرو سے ملا، ان بے چارے نے بھی میری حمایت کی، جب کہیں جاکر جون ۵۱ء میں پنشن دوبارہ کھلی۔

(ایضاً، ص ۳۱۴)

○

کلکتہ ایک بار ۱۳ء میں اپنے آخری دورِ طالب علمی میں جانا ہوا، اجنبی شہر تھا، مولانا ابوالکلام نے زبردستی اپنا مہمان بنا لیا، اور ایک ہفتہ تک پوری خاطرداریوں کے ساتھ مہمان بنائے رکھا۔

(ایضاً، ص ۲۳۰)

"موثر، محسن، عزیز شخصیتیں"، کے عنوان سے "آپ بیتی" کے باب ۵۴ میں لکھتے ہیں:۔

"محض زبان کی حد تک، مرزا محمد ہادی رسوا، رتن ناتھ سرشار، ریاض خیرآبادی، اور کسی درجہ میں ابوالکلام آزاد، اور محمد حسین آزاد، اور خواجہ حسن نظامی۔"

(ایضاً، ص ۲۵۴)

الندوہ، وقت کا ممتاز ترین پرچہ تھا، دو سال قبل یہ گمان بھی نہیں کر سکتا تھا کہ کبھی اس میں بھی کچھ لکھوں گا، لیکن ۱۹۱۱ء میں جب پرچہ مولانا سید سلیمان ندوی کے ہاتھ میں تھا تو انگریزی سے ایک آدھ مضمون کا ترجمہ کر کے اس میں دیا، الندوہ کے فرنے "الہلال" (کلکتہ) کو یاد دلا دیا۔ ایک آدھ ترجمہ کسی ادبی رسالے سے الندوہ کے لیے بھیجا تھا، اور وہاں سے الہلال میں پہنچ گیا، اور میری مرضی کے خلاف اس میں چھپ بھی گیا، اور اب، آج کوئی یقین کرے یا نہ کرے ۱۹۱۱ء ۱۹۱۲ء میں الندوہ میں اپنا مضمون چھپ جانا باعثِ فخر سمجھتا تھا اور الہلال میں اس کے برعکس۔

مولانا ابوالکلام سے ذاتی تعلقات اس وقت بھی خاصے تھے، لیکن ان کے پرچہ الہلال کی علمی حیثیت کی کوئی وقعت دل میں نہ تھی، ایک ہی آدھ سال بعد خود صاحب الہلال سے الہلال میں نوک جھونک نفسیات کی ایک علمی اصطلاح سے متعلق شروع ہوئی اور افسوسناک بے لطفی پر ختم ہوئی۔

(ایضاً، ص ۲۱۴)

اگست ۱۹۱۹ء میں انھوں (ظفر الملک علوی) نے میری نگرانی میں ایک اور ہفتہ وار لکھنؤ سے نکالا۔ نام میری ہی تجویز پر "حقیقت" رکھا، اور باضابطہ ادارت کے لیے اپنے ایک عزیز اور میرے عزیز شاگرد و جلیس، انیس احمد عباسی کاکوروی، تازہ گریجویٹ کو رکھا۔ مدتوں اس کی ادارت کا بڑا حصہ پس پردہ میں ہی انجام دیتا رہا، اور مولانا ابوالکلام وغیرہ

پر برابر تحسین و حوصلہ افزائی کرتے رہے۔

(ایضاً، ص ۲۱۷)

○

اور محض ادب و زبان کی حیثیت سے قائل محمد حسین آزاد، ابوالکلام آزاد، سجاد حسین (اودھ پنچ) راشد الخیری، ریاض خیرآبادی، عبدالحلیم شرر، رتن ناتھ سرشار، محمد علی، سید محفوظ علی اور خواجہ حسن نظامی کا رہا ہوں۔

(ایضاً، ص ۳۰۷)

○

شبلی کے بعد اگر زبان کسی سے میں نے سیکھی ہے تو ان حضرات سے، مرزا محمد ہادی رسوا، مولوی نذیر احمد دہلوی، اور سرشار لکھنوی اور ریاض خیرآبادی، دونوں آزادوں (محمد حسین آزاد اور ابوالکلام آزاد) کے رنگ وانشار کی داد میں نے بارہا دی ہے، فقروں، ترکیبوں پر جھوم جھوم گیا ہوں، لیکن اس ساری داد و تحسین کے باوجود ان کے رنگ کے تقلید کی ہمت نہ ہوئی، اور اگر کبھی کچھ کرنا چاہا بھی تو نبھ نہ سکی، ان پر شکوہ عبارتوں میں خاصہ رنگ تکلف کا نظر آیا، اپنا جی ان تحریروں پر لوٹ ہوتا رہا، جو سلیس، سادہ، بے تکلف، رواں، ٹھیک، بے ساختہ ہوں۔"

(ایضاً، ص ۲۰۸)

○

مخالفین و معاندین:

سوچنے سے اس وقت دو صحافیوں کے نام یاد ہو رہے ہیں (ایک مقیم کلکتہ، اور دوسرے بھوپالی) جن میں سے ایک پاکستانی ہو گئے تھے، اور دونوں اب انتقال کر چکے ہیں، اور چونکہ مسلمان تھے، اس لیے مغفور بھی ہو گئے ہوں گے، لیکن جس حد تک میرے مجرم تھے، میرے ہی معاف کرنے سے ان کی معافی ہو گی، اور دو صاحب اسی ٹائپ کے دہلی کے بھی ہوئے ہیں، جن میں سے ایک بڑے ممتاز اہل قلم تھے، دوسرے محض صحافی، یہ دونوں بھی مرحوم ہو چکے ہیں، اور خدا کرے کہ قبل وفات اپنے اس زورِ قلم، پر پشیمان ہو چکے ہوں۔

ایک آدھ غیر مسلم پرچہ کو چھوڑ کر، زندہ حضرات میں میرے شدید ترین دشمن لاہور کے ایک معلوم و معروف صحافی ہیں، جو شاید میری موت کی تمنا میں ہر وقت رہتے ہیں، اور اپنے پرچہ میں کئی سال قبل میرا ذکر "قبر میں پیر لٹکائے ہوئے" کی حیثیت سے کر چکے ہیں۔ اپنے پرچہ میں بدزبانی اور تہمت طرازی کا پورا ترکش خالی کر چکے ہیں، اس بے بنیاد جرم میں کہ میں مولانا ابوالکلام کا شدید دشمن ہوں! حالاں کہ مرحوم سے میری جو مخالفت تھی، وہ صرف الہلال کے شروع زمانے کی تھی، ۱۲ء ۱۳ء میں ۱۶ء میں، تو وہ ختم بھی ہو چکی تھی۔ دعا ہے کہ حشر میں جب ان کا سامنا ہو، تو ان سے بجائے مطالبۂ انتقام کے اپنے دل میں اتنی وسعت پاؤں کہ عفو و درگزر سے کام لوں۔

(ایضاً، باب ۴۸، ص ۲۷۴، ۲۷۵)

○

جب سن اور آیا اور دماغ کو کالج کی ہوا لگی، تو دیکھا کہ فضائے ادب میں ایک نیا جھنڈا ابوالکلام آزاد کا لہرانا شروع ہوا ہے، اس تنومند کی پہلوانی اور شہ زوری دیکھ کر زبان پر واہ واہ تو بے اختیار آئی، لیکن دل و دماغ سے مشورہ کیا تو ہمت ان کی راہ پر قدم اٹھانے کی نہ پائی۔"

"میری ادبی زندگی کے ناقابل فراموش واقعات و شخصیات"

(صدق جدید۔ ۳ فروری ۱۹۶۱ء)

لہ مخالفین و معاندین کے ذیل میں جن صحافیوں کا ذکر آیا ہے، ان میں سے مقیم کلکتہ سے مراد مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی ہیں، بھوپالی سے اشارہ ابوسعید بزمی کی طرف ہے، لاہور کے شدید ترین دشمن سے مقصود شورش کاشمیری مرحوم کی ذات ہے، دہلی میں اس ٹائپ کے دو صحافی کون تھے؟ میں ان سے بالکل واقف نہیں۔ فی الحال فاضل محترم پروفیسر تحسین فراقی صاحب بھی ان حضرات کی نشان دہی نہیں فرما سکے۔

عفو خواہی و معذرت

مغفوریت مسلم

(ایک خط کی نقل)

(فلاں ایڈیٹر) نے ابوالکلام نمبر (فلاں پرچہ[1]) میں آپ کا ایک خط نقل کیا ہے۔ جس میں آپ نے لکھا ہے کہ مولانا آزاد کو رحمۃ اللہ اس لیے نہیں لکھتا کہ کوئی یقینی نہیں کہ اُن کی بخشایش بھی ہوگئی ہو۔ . . . . صاحب کے ذریعہ معلوم ہوا کہ وہ خط آپ کا نہیں اگر واقعی نہیں ہے تو تحریر کریں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی تردید میں ایک مضمون لکھوں تاکہ (ایڈیٹر صاحب) کی افترا پردازی کا پردہ چاک ہو۔ عتیق الرحمٰن آردی

از دار العلوم ندوہ ۷، مارچ ۶۵ء

نقل جواب

(از عبد الماجد)

مجھے بالکل یاد نہیں پڑ رہا ہے کہ میں نے ابوالکلام مرحوم و مغفور کے لیے کبھی یہ الفاظ لکھے ہوں۔ اور اس کا یقین بھی نہیں آ رہا ہے۔ اس لیے کہ یہ میرے مسلک و عقیدہ کے عین خلاف ہے، میں تو ہر ادنیٰ سے ادنیٰ کلمہ گو کے حق میں بھی دعائے رحمت و مغفرت کا عادی ہوں۔ چہ جائیکہ مولانا کی سی جلیل القدر و باعثِ فخر ہستی کے لیے! لفظی لحاظ سے تو یہ بے شک صحیح ہے کہ بجز انبیاء معصومین اور عشرۂ مبشرہ کے اور کسی کی بھی مغفوریت یقینی نہیں کہی جا سکتی، لیکن بہر حال عملاً تو ہم ہر کلمہ گو کو بہ لحاظ حسن ظن و اغلبیت جنتی ہی سمجھتے ہیں۔ چہ جائیکہ ایسے کو جو خدمت علم و دین میں اتنا ممتاز ہو!

---

[1] پرچے سے مراد ہفت روزہ چٹان، لاہور اور ایڈیٹر سے اشارہ شورش کاشمیری مرحوم کی طرف ہے

اگر کہیں میں نے وہ الفاظ لکھے بھی ہوں، تو واللہ اعلم کس سیاق ہیں۔ اور کس سوال کے جواب میں؟ اور اب مولانا کی روح سے معذرت کے ساتھ انھیں بصد ندامت و تاسف واپس لیتا ہوں اور آں عزیز کو اختیار دیتا ہوں کہ میری اس معذرت کو اسی اخبار میں یا جہاں کہیں چاہیں چھپوا دیں۔

(۱۱ر مارچ ۱۹۶۵ء)

(صدق جدید۔ ۲۶ر مارچ ۱۹۶۵ء)

مولانا ابوالکلام

مراسلہ

حال ہی میں معلوم ہوا ہے کہ آنجناب کی جو رائے مولانا ابوالکلام آزادؒ سے متعلق تھی اس میں کچھ ترمیم ہوئی ہے۔ چونکہ آنجناب اس سے قبل صدق میں ان کے بارے میں اظہار خیال فرما چکے ہیں۔ اس لیے کیا اچھا ہو کہ موجودہ رائے کا بھی صدق میں اظہار ہو جائے تاکہ قارئین "صدق" صحیح صورت حال سے واقف ہو جائیں۔ —— از علی گڑھ

جواب :۔ صدق :۔ مکتوب مولانا مرحوم کے ایک معتقدِ خصوصی کے قلم سے۔ جو کچھ حسن ظن صدق و مدیر صدق سے بھی رکھتے ہیں —— یہ بات خوشی بلکہ فخر کی ہے کہ حلقۂ صدق میں ایسے مخلصین موجود ہیں، جو صدق کو اس کی غلط روی پر ٹوک دینے کی سعادت حاصل کر لیتے ہیں۔

مکتوب میں دو متعین مثالیں بھی درج ہیں۔ ایک مولانا کی عدم پابندی نماز۔ دوسرے ایک شغل شبانہ۔ اب بالکل یاد نہیں پڑتا کہ صدق میں کبھی یہ تذکرے آئے تھے۔ سرسری نظر سے اس کی فائل جو دیکھی اس سے بھی کچھ مدد نہ ملی اور زیادہ تفصیل سے تلاش کرنے کا وقت نہ نکل سکا۔ لیکن اتنی کرید کی ضرورت ہی نہیں۔ معزز مکتوب نگار کا بیان خود کافی ہے۔ اگر یہ دونوں باتیں مدیر صدق کی کسی تحریر میں آچکی ہیں تو انھیں اب

کالعدم سمجھا جائے، شرعی شہادتیں نہ پہلے موجود تھیں نہ اب ہیں، اور کسی مسلمان کے خلاف ایسے شدید الزامات۔ بغیر ثبوت شرعی کے ہرگز درست نہیں۔ اللہ معاف فرمادیں۔ اور مولانا کی روح بھی معاف فرمائے۔

ایسی روایتیں زبان زد بے شک تھیں۔ لیکن کسی دورِ زندگی سے متعلق اگر صحیح ہوں بھی تو کیا ضرور ہے کہ وہ بعد کی زندگی میں صحیح رہی ہوں، عمر کے ابتدائی اور آخری دَور کے درمیان فرقِ عظیم کی مثالوں سے تو حضرات صحابہ کی زندگیاں بھی بھری پڑی ہیں ــــ اور مولانا کی زندگی میں اصلاحی و اخلاقی انقلاب تو ایک مشاہدہ کی چیز تھی۔

مکتوب میں ایک سوال یہ بھی ہے کہ صدق نے فلاں فلاں کی وفات پر ان کی زندگی کا احتساب کیوں نہ کیا؟ یہ انفرادی بحث اگر چل نکلی تو کبھی بھی ختم نہیں ہو سکتی۔ ہر جواب پر ایک مزید سوال پیدا ہوتا ہی چلا جائے گا۔ اور سوال ایسا ہی ہے جیسے یہ پوچھا جائے کہ صدق فلاں فلاں ہی مسائل پر کیوں لکھتا ہے۔ فلاں فلاں دوسرے مسائل پر کیوں نہیں لکھتا۔ کوئی نہ کوئی معیار انتخاب کرنا تو ہر ایڈیٹر کے لیے ناگزیر ہے۔

ایک سوال یہ ہے کہ کسی صاحب نے مدیر صدق سے پوچھا کہ صدق مولانا کو رحمۃ اللہ علیہ کیوں نہیں لکھتا۔ تو اس کا جواب اس قسم کا دیا کہ اللہ کی رحمت کا مستحق ہر شخص کو کیسے سمجھ لیا جائے ــــ اگر یہ جواب خط میں گیا تو یقیناً سائل کی شخصیت پرستی کے غلو کی اصلاح کی خاطر ہوگا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ صدق ادنٰے سے ادنٰے مسلمان کی بھی مغفرت و مغفوریت کی قوی ترین امید رکھتا ہے۔ تو بھلا مولانا مرحوم سے متعلق ایسا بخل کیونکر روا رکھ سکتا تھا!

(صدق جدید۔ ۱۷؍اکتوبر ۱۹۶۹ء)

ل مراسلہ ڈاکٹر ریاض الرحمٰن شروانی کا تھا، جس کا جواب مولانا دریابادی نے یہ دیا۔

تبصرے

مولانا ابوالکلام آزاد کی کتابوں اور ان سے متعلق کتابوں پر تبصرے

آثارِ ابوالکلام :

از قاضی عبدالغفار صاحب مرحوم ۲۲۵ صفحہ مجلد مع گرد پوش قیمت تین روپیہ ۷۵ نئے پیسے، پتہ: آزاد کتاب گھر، کلاں محل دہلی۔

کتاب کئی سال قبل شائع ہوئی، اور صدق میں بھی اس کا تذکرہ اسی وقت آچکا ہے، اب یہ نیا ایڈیشن نکلا ہے "بعد ترمیم واضافہ"، لیکن یہ کہیں سے کچھ بھی نہیں کھلتا کہ مصنف مرحوم کے انتقال کے بعد یہ ترمیم واضافہ کس نے اور کس حد تک کیا ہے۔

کتاب مولانا ابوالکلام کی سوانح عمری کسی معنی میں بھی نہیں، اور نہ مصنف نے اس کا دعویٰ ذرا سا بھی کیا ہے، وہ صرف ان کا بلکہ ان کی انشاء کا ایک نفسیاتی مطالعہ ہے —— کتاب صرف دو مقالوں میں تقسیم ہے، نقش اول، و نقش ثانی۔ درحقیقت یہ صرف انھیں دو طویل مقالوں کا مجموعہ "کتاب" کا اطلاق اس پر ذرا مشکل ہی سے ہو سکے گا۔

قاضی صاحب کا قلم بڑا جاندار تھا، زندگی اور جان اس کی سب سے بڑی اور پہلی خصوصیت تھی، وہ اس میں بھی شروع سے آخر تک جلوہ گر ہے اور کیوں نہ ہوتی، یہ تحریر بھی تو ان کے آخری عہد کی ہے، جب ان کا قلم اپنی پوری پختگی کو پہنچ چکا تھا، تو ایک تو تحریر کی بے پناہ شوخی، اور اس پر مولانا کی انشاء کیا غضب کی رنگارنگی (جس کے نمونے کتاب بھر میں بکھرے پڑے ہیں) نتیجہ قدرتاً یہ نکلا، کہ کتاب دلآویزیوں کا ایک مُرقع بن گئی، اور پڑھنے والا اس لذت میں ایسا گم اور بے ہوش ہو جاتا ہے کہ ادھر اس کا دھیان بھی نہیں جاتا کہ جو باتیں کہی گئی ہیں۔ وہ متوازن اور قابل اخذ و قبول کس حد تک ہیں!

ابوالکلام آزاد :

ازانور عارف صاحب : ۲۷۲ صفحہ، مجلد مع گرد پوش قیمت للعہ روپئہ : مکتبہ ماحول ۹ بہادر شاہ مارکیٹ، بندر روڈ، کراچی (پاکستان)

مولانا ابوالکلام مرحوم ومغفور کے ارادت مندوں کی دنیا۔ ہندوستان ہی تک محدود نہیں۔ پاکستان میں بھی ان کی تعداد اچھی خاصی پائی جاتی ہے، اور بہ کثرت مقالوں، رسالوں کے علاوہ اب پاکستان نے یہ تحفۂ عقیدت، مستقل کتابی شکل میں پیش کیا۔

کتاب دیباچہ کے علاوہ ۲۲ مضمونوں کا مجموعہ ہے، جو مولانا یا ان کے متعلقات پر، اب تک مختلف پرچوں میں نکل چکے ہیں۔ اور مضمون نگاروں کی فہرست میں نام ڈاکٹر سید محمود۔ نیاز فتحپوری، شورش کاشمیری، ملا واحدی، مولوی عبدالرزاق خاں ملیح آبادی، جگن ناتھ آزاد وغیرہ کے نظر آتے ہیں، ایک ایک مضمون پنڈت جواہر لال اور ہمایوں کبیر صاحب کے قلم سے، انگریزی سے ترجمہ ہو کر آیا ہے۔ ایک مضمون مولانا کی اہل خانہ محترمہ پر دلی کی ایک خاتون کا لکھا ہوا ہے ــــــ ظاہر ہے کہ مجموعہ میں تنوع پوری طرح موجود ہے، اور ہر مضمون اپنے لکھنے والے کے درجۂ تعلق وارادت کا مظہر ہے۔ مولانا کی سیاسی، ادبی اور شخصی زندگی کے بہت سے پہلوؤں کی جھلک ان اوراق میں نظر آجاتی ہے۔ ایک لمبا مکتوب خود مولانا کے قلم سے میر اور غالب کی روایتی ملاقات پر ہے، اور اس کے ضمن میں مولانا کی اپنی ابتدائی شعر گوئی کے کمال کا ذکر بھی تفصیل سے آگیا ہے، محمد اجمل خاں صاحب (پرائیوٹ سکریٹری) کا مضمون مولانا کے نام کے بعض خطوط اور ان کے جوابات پر اچھا ہے۔

شروع میں مولانا کے چند خطوط کا عکس بھی دے دیا گیا ہے، گرد پوش کے علاوہ کتاب میں دو تصویریں بھی مولانا کی درج ہیں۔ ایک پر ۱۹۳۴ء درج ہے، اور وہ صحیح ہے، دوسری پر درج ہے "مولانا آزاد بہ حیثیت ایڈیٹر الہلال والبلاغ" یہ پوری طرح صحیح نہیں۔ یعنی یہ تصویر ۱۲ء و ۱۴ء کی نہیں، اس سے دو چار سال قبل کی ہے۔ ابوالکلامیت کے طلبہ اور مولانا کے ارادت مندوں کے لیے یہ مجموعہ کام کا تیار ہوگیا ہے۔

(۶ ر نومبر ۱۹۵۹ء)

BASIC CONCEPTS OF THE QURAN

(انگریزی) "قرآن کے بنیادی تصورات" از مولانا ابوالکلام آزاد، مرتبہ ڈاکٹر سید عبداللطیف
۱۸۰ صفحہ مجلد مع گرد پوش، قیمت ہے، پتہ: اکیڈمی آف اسلامک اسٹڈیز۔ ۴/۰۷ آغا پورہ،
حیدر آباد دکن۔

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے جس خاص رنگ میں قرآن مجید کی شرح و ترجمانی اپنی نا تمام کتاب ترجمان القرآن کے ذریعہ سے کرنا چاہی تھی، اس کا علم پڑھے لکھوں کو ہے۔ پیشِ نظر کتاب انھیں کے دینی خیالات کا پرتو ملخص ہے، جو ڈاکٹر سید عبداللطیف حیدرآبادی نے مرحوم کی تفسیر سورۃ الفاتحہ سے لے کر انگریزی میں تیار کر دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب انگریزی کے ایک مسلّم ادیب ہیں، اور مذہبی خیالات بھی ایک خاص نوعیت کے رکھتے ہیں۔ جمہور اہل سنّت سے الگ، مولانا کے مسلک میں انھیں اپنے خیالات کا عکس نظر آیا۔ اور یہ ہم خیالی انھیں ان کی تفسیر کے بالکل ابتدائی جزو کے انگریزی ترجمہ و تلخیص پر لے آئی۔

کتاب مرتب کے خوب مفصل دیباچہ کے بعد چھ بابوں میں تقسیم ہے۔ قرآنی تصوّرِ الٰہ، صفت ربوبیت، صفات رحمانیت و رحیمیت، صفت عدل، وحدتِ وحیِ الٰہی، اور وحدتِ نسلِ انسانی پر ——— خلاصۃ الخلاصہ یہ کہ "دین" ہمیشہ ایک رہا ہے، اور ایک رہے گا۔ البتہ "شریعتیں" یا "منہاج" بدلتے رہے ہیں۔ جو لوگ مولانا کے مسلک سے ہم رنگی رکھتے ہیں وہ ضرور اس کتاب کی قدر کریں گے۔

(۱۳ر نومبر ۱۹۵۹ء)

ابوالکلام آزاد:

۲۲۴ صفحہ۔ مع متعدد تصاویر، قیمت عہ، پتہ: پبلیکیشنز ڈویژن۔ منسٹری آف انفارمیشن (وزارت اطلاعات) نئی دہلی۔

کتاب کوئی مرتب "کتاب" نہیں۔ صرف متفرق مضامین مختلف قلموں سے لکھے ہوئے، اور متعدد دماغوں سے نکلے ہوئے، کا مجموعہ ہے۔ زیادہ تر نثر میں اور کچھ منظوم

ـــــ عقیدت کے ہاتھوں نے رنگ بہ رنگ پھولوں کو جوڑ کر ایک خوشنما و دیدہ زیب گلدستہ تیار کر دیا ہے۔ ایک آدھ مضمون انگریزی سے ترجمہ ہو کر بھی آیا ہے، قدرتاً یہ کتاب، سیرت یا سوانح عمری کا کام نہیں دے سکتی۔ پھر بھی مرحوم کی زندگی کی جھلکیاں اچھی خاصی ان اوراق میں محفوظ ہو گئی ہیں۔

مضامین سب کے سب معتقدوں اور مداحوں ہی کے قلم سے ہیں اور بعض شاید ایسے بھی ہیں۔ جو مولانا کی وفات کے معاً بعد تحریر ہوئے ہیں، اور اس لیے قدرۃً ان میں جذبات و تاثرات کی شدت بھی موجود ہے۔ اور واقعات کی تحقیق و استناد کی طرف پورا التفات قائم نہیں رہ سکا ہے۔ مثلاً مہر صاحب کے قلم سے، مولانا کی سیر چشمی اور خودداری کی مثال میں جو حکایت ایک رئیس کا عطیہ واپس کر دینے کی۔ ص ۱۵۵ تا ص ۱۵۷ بڑی تفصیل سے درج ہے۔ وہ مزید ثبوت کی محتاج تھی۔ ۱۹۱۲ء میں جب یہ ذکر الہلال میں پہلی بار آیا تھا۔ اس وقت اس پر بڑی قیل و قال ہو چکی ہے[1] ـــــ الندوہ کی ایڈیٹری کی حیثیت بھی تمامتر افسانوی ہے۔ دنیا کے ہر بڑے شخص کی طرح مولانا کا بھی ایک دور آخر نو عمری اور نو مشقی کا بھی رہا ہے اور عمر و مشق کے اس دور میں الندوہ کی مضمون نگاری ہی بڑے امتیاز و افتخار کی چیز تھی۔

بعض مضامین بڑے بصیرت افروز اور معلومات افزا ہیں۔ مثلاً ملیح آبادی صاحب کے قلم سے مولانا کے فقر و فاقہ پر، واقعی اب تک لوگ مولانا کی سیرت کے اس روشن و تابناک پہلو سے بے خبر تھے۔ حافظ علی بہادر خاں صاحب کا مضمون بھی، مولانا کی جیل کی زندگی پر اپنی تصریحات سے اور اس سے بھی بڑھ کر بین السطور سے روشنی ڈالنے والا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، خان بہادر ظفر حسین خاں، محمد اجمل خاں صاحب کے مضامین اور حمیدہ سلطان صاحبہ کا مضمون بیگم آزاد پر، یہ سب پڑھنے کے قابل ہیں۔ حصہ نظم میں یحییٰ اعظمی صاحب کا مرثیہ شاعرانہ اعتبار سے قابل قدر ہے، ظفر حسین خاں صاحب نے نفسیاتی دقت نظر سے کام لے کر مولانا کی سیرت کا جوہری خلاصہ ان لفظوں میں پیش کر دیا ہے:۔ "غور کیجیے تو ان

کی شخصیت کا مایۂ خمیر ادب ہی تھا، اور وہی ان کے مشاغل کے مختلف میدانوں میں مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتا رہا . . . . مولانا سیاسیات میں بھی ادبی دروازے سے داخل ہوئے۔ الہلال اور البلاغ بہترین سیاسی رسالوں سے پہلے بہترین ادب پارے تھے، جنہوں نے جمہور کے دل میں جگہ کر کے مولانا کو لیڈروں کی صفِ اوّل میں کھڑا کر دیا۔ غرضکہ ہر شعبۂ حیات میں مولانا کی عظمت ان کی انشاء پردازی کی رہین منت ہے، اور یہی کہنا چاہیے ان کا اصلی جوہر ہے۔" (ص ۹۱)

بالکل آخری صفحہ پر جو سادہ اور سنہ دار فہرست واقعات زندگی کی درج ہے، وہ نظرثانی کی محتاج ہے۔ ۱۹۰۵ء میں ازہر (قاہرہ) تعلیم کے لیے جانے اور ۱۹۰۷ء میں وہاں سے واپس آنے کی مدیں تو بہر حال قابل اخراج ہیں۔ ہندوستان سے اس وقت باہر جانا ہی معرض گفتگو میں ہے، اس طرح ابتدائی زمانہ میں الندوہ میں مضمون نگاری اور اس زمانہ کے بعد سہ روزہ وکیل (امرتسر) کی ایڈیٹری درج ہونے سے رہ گئی ہے ـــــ تبصرہ نگار بہر حال مسلمان ہے، اور اسے یہ دیکھ کر قدرۃً تاسف ہوا کہ کسی ایک مضمون نگار نے بھی مولانا کی دینی زندگی کا نقشہ، تفصیلاً کیا معنی اجمالاً بھی پیش نہ کیا۔

کتاب بہ حیثیت مجموعی ایک بہت بڑے حلقے کو اپیل کرنے والی ہے۔ اور یقین ہے کہ اس حلقہ میں اسے ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔

(۲۰ر نومبر ۱۹۵۹ء)

ذکر آزاد:

از ملیح آبادی ۔ ۶۷۔۴ صفحہ قیمت معہ، پتہ: دفتر روزنامہ "آزاد ہند" ۲۲ ساگر دت لین کلکتہ ۱۲

کتاب کا دوسرا عنوان ہے۔ "مولانا ابوالکلام آزاد کی رفاقت میں ۳۸ سال" کتاب

لہ کسی اخبار یا رسالے میں کسی شخص نے مولانا آزاد کے اس بیان کو چیلنج نہیں کیا تھا، مولانا کے نکتہ چینوں کے حلقے میں اور نجی کی محفلوں میں شاید قیل و قال ہوئی ہو۔

بجائے خود دلچسپ ہے اور اس لحاظ سے مفید بھی کہ متعدد تحریریں اور تقریریں مولانا مرحوم کی اس میں بجنسہٖ دے دی ہیں۔ لیکن مولانا کے بعض واقعی یا فرضی "مخالفین" خصوصاً دینی و علمی دونوں حیثیتوں سے ایک نامور ترین بزرگ ملت کی ہجو میں تمیزداری اور خوش ظرفی کا جو "کمال" دکھایا گیا ہے، وہ کتاب کے سارے ہی اجزاء کی طرف سے دل کھٹا کر دینے کے لیے کافی ہے۔

(۱۱ رمارچ ۱۹۶۰ء)

ترجمان القرآن:

کتاب بجائے خود اچھی خاصی ہے، البتہ دیوبند اور دوسرے قدیم علماء کے مکتبہ خیال کی ترجمانی اس میں ملحوظ نہیں رہتی ہے، رہیں غلطیاں تو ان سے کون سی بشری تصنیف خالی ہوسکتی ہے۔

ایک استفسار کے جواب میں، ۲۶ راکتوبر ۱۹۶۲ء)

امام الہند:

از ابو سلمان الہندی۔ ۳۷۹ صفحہ مجلد مع گرد پوش مصور۔ قیمت ۶ روپے

مکتبہ اسلوب کراچی ۱۸

یہ کتاب مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی کے ابتدائی دَور یعنی ۱۸۸۸ء تا ۱۹۱۲ء تک پر رہے۔ ایک معتقد خصوصی کے قلم سے خاصی دلچسپ بھی ہے اور مفصل بھی، البتہ سررشتہ تحقیق بار بار ہاتھ سے چھوٹ گیا ہے۔ اور جو باتیں ثبوت طلب تھیں وہ بلا ثبوت ہی درج ہو گئی ہیں۔ مثلاً (صـ ۴۳) مرزا محمد ہادی مرزا موسیقی میں کمال رکھنے والے سے شوق موسیقی کی تکمیل (صـ ۴۳) سفر ٹر کی و فرانس (صـ ۴۶) راجہ نواب علی خاں کی ایک معلوم و معروف کتاب "معارف النغمات" کا مولانا کی جانب انتساب (صـ ۳۳۶) اس کا زمانہ تصنیف ۱۹۰۵ء-۰۶ء ہونا (حالانکہ یہ اس کے کئی سال بعد کی ہے) ایک مستقل عنوان "مرزا محمد ہادی رسوا" ہے (صـ ۳۲۷ تا صـ ۳۳۴) اس میں بھی مبالغہ بیانی کثرت سے ہے اور اس طرح مولانا آزادؒ کی انگریزی دانی و فرانسیسی دانی کے باب میں۔

کتاب لکھی تلاش اور محنت سے گئی ہے، مزید اصلاح و نظر ثانی اور صاحب سوانح کے علاوہ دوسرے حضرات کے حالات میں حذف و ایجاز سے کام لینے اور عبارت میں جا بجا توازن پیدا کرنے کے بعد اس سے بہتر ہو سکتی ہے۔

(۸ / نومبر ۱۹۶۳ء)

ادائے زکوٰۃ کا اسلامی طریقہ:

۱۶ صفحہ، امارت شرعیہ، پھلواری شریف، ضلع پٹنہ۔

مولانا ابوالکلام مرحوم و مغفور کا ایک کارآمد و قابل قدر مضمون۔

(۶ / دسمبر ۱۹۶۳ء)

ترجمان القرآن، جلد ۲:

از مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم، ۸۸۴ صفحہ ٹائپ و مجلد قیمت ۲۲ / پتہ: ساہتیہ اکاڈمی نئی دہلی۔

ترجمان القرآن طبع اول مدت ہوئی نایاب ہو چکی تھی، اب دو چار سال سے ساہتیہ اکاڈمی نے اس کا دوسرا ایڈیشن نکالنا شروع کیا ہے، نظر ثانی، اصلاح و اضافہ کے بعد۔ پہلی جلد سورہ فاتحہ پر تھی۔ اور اس کا تعارف ان کالموں میں آ چکا ہے۔ یہ دوسری جلد اب نکلی ہے، اور یہ سورۂ بقرہ سے لے کر سورۂ انعام تک پانچ لمبی سورتوں کی ہے —— جلد اول جس قدر تفصیل بلکہ تطویل کی حامل تھی، ٹھیک اسی نسبت سے یہ جلد اختصار بلکہ اجمال کی تصویر ہے۔ کسی مستقل تفسیر کے بجائے صرف جا بجا مختصر تفسیری حاشیوں اور اشاروں کا مجموعہ۔ حجم و ضخامت میں تفسیر بیضاوی سے بھی کہیں کم۔

ان ۸۸۴ صفحوں میں سے ۸۱ تو بڑی مفصل فہرست مطالب ہی کی نذر ہو گئے ہیں۔ اور اصل کتاب ص ۸۱۶ پر ختم ہو گئی ہے، ص ۸۱۷ سے ص ۸۷۶ تک مرتب کے حواشی چلے گئے ہیں۔ یعنی پہلے ایڈیشن کی نکالی ہوئی، یا اس پر بڑھائی ہوئی عبارتوں کی نقل۔ باقی نو صفحہ اشاریہ کی نذر —— مرتب نے اپنی طرف سے محنت و قابلیت دونوں کا ثبوت پیش کر دیا ہے۔

(۲۸ / اپریل ۱۹۶۷ء)

مضامین لسان الصدق : مرتبہ عبد القوی دیسنوی

مولانا ابوالکلام مرحوم کے پرانے پرچہ "لسان الصدق" کا اب صرف نام ہی نام سننے میں آرہا تھا۔ دیسنوی صاحب نے اچھا کیا کہ اپنے وطن دیسنہ کی لائبریری سے اس پرچہ کی فائل نومبر ۱۹۰۳ء سے جولائی ۱۹۰۴ء کی کھوج نکالی، اور ان کے مضمونوں کو اپنے ایک دلچسپ دیباچہ کے ساتھ شائع کر دیا۔

(۱۴ر جون ۱۹۶۸ء)

خطباتِ آزاد (مرتبہ مالک رام)

مولانا ابوالکلام مرحوم و مغفور اردو کے بہترین مقرروں اور خطیبوں میں تھے، اور اپنے زمانے کے بہترین اور شائستہ ترین لکھنے والے بھی، ان کی ہزارہا تقریروں اور خطبات کا بہترین انتخاب۔

(۳ر جنوری ۱۹۷۵ء)

آہ ابوالکلام!

آج وہ اٹھ گیا۔

۱۔ جو اُردو ادب و انشاء میں ایک ممتاز ترین مقام رکھتا تھا۔ جس کا اس میدان میں کوئی سہیم و شریک نہ تھا اور جس نے اپنا کوئی جانشین نہیں چھوڑا۔

۲۔ جو اُردو زبان کا ایک بہترین مقرّر و خطیب تھا۔

۳۔ جو مدّتوں دین و قرآن کی خدمت بھی اپنی بصیرت و ادراک کے مطابق کرتا رہا۔

۴۔ جو ملکی سیاسیات کی صفِ اوّل میں ۴۰، ۴۵ سال سے رہا کیا تھا۔

۵۔ جس نے اُردو صحافت میں ایک بالکل نیا اور شاندار باب کھول دیا۔

۶۔ جو عظیم الشان تحریکِ خلافت کے اکابر کی، کہنا چاہیے کہ اب آخری یادگار رہ گیا تھا۔

۷۔ جو اب ایک پیکرِ شرافت بن گیا تھا۔ اور ۱۹۴۷ء کے بعد سے خدا معلوم کتنے بے سہاروں کا سہارا بنا رہا!

اللہ بال بال مغفرت فرمائے! اللھم اغفرلہ وارحمہ۔

(صدق جدید۔ ۲۸ فروری ۱۹۵۸ء)

دریاباد

۱۸؍اپریل ۱۹۵۸ء بسم اللہ

پیام[1]

اردو ادب نے مولانا آزاد کی یاد میں جو خصوصی نمبر شائع کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ ہر طرح مبارک وقابلِ تحسین ہے۔ اس سے کم سے کم ایک ظلم کی تو کسی حد تک تلافی ہو جائے گی اس دس بیس برس کے اندر اردو ادب کی تاریخ پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ آزاد نامے ایک بڑے ادیب و انشاء پرداز کی کوئی ہستی موجود ہی نہیں ہے! یہ کتنا بڑا ظلم ہوا ہے! یہ ظلم دو چار اور صاحبوں پر بھی ہوا ہے لیکن مظلوم اعظم آزاد ہی ہیں۔

مولانا کی دینی وسیاسی خدمات کا جائزہ تو دوسرے بھی لے سکتے ہیں۔ لیکن ان کی ادبی اور انشائی خدمات کا صراحت وتفصیل سے جائزہ لینا آپ کے رسالہ کا خاص موضوع ہونا چاہیے۔ اتنا وقت کہاں سے لاؤں کہ خود شرح وبسط سے لکھوں۔ کچھ نہ کچھ بہر حال صدق میں لکھ ہی چکا اور آپ کے علاوہ چار چار جگہوں سے اور فرمائشیں آئی ہوئی ہیں۔ آپ کے رسالہ نے اگر یہ کام کر دیا تو گویا سب کی طرف سے ایک ادبی فرضِ کفایہ ادا کر دیا اور تاریخ ادب کے دامن سے ایک بدنما دھبے کو دور کر دیا۔

مولانا کی انشاء کے مختلف دور قائم کرنے لازمی ہیں، تین دور تو کھلے ہوئے ہیں اور شبلی اسکول سے ان کا تعلق واضح کرنا ضروری ہے۔ یہ ایک عجیب لطیفہ ہے کہ شبلی سے اتنا قریب اور متاثر ہو کر بھی مولانا دور اور غیر متاثر رہے۔

والسّلام

عبدالماجد

---

[1] یہ پیام پروفیسر آل احمد سرور کو "اردو ادب" علی گڑھ کے "مولانا آزاد نمبر" کے لیے بھیجا گیا۔ لیکن کسی وجہ سے اس نمبر میں شائع نہ ہو سکا۔

ایک جنتی خاتون

"ان کی پاکیزگی خیالات کا یہ عالم تھا کہ کبھی ٹیلیفون کا ریسیور اس لیے نہیں اٹھاتی تھیں کہ نہ جانے دوسری طرف کون اور کیسا آدمی بات کر رہا ہے۔ اس زمانہ میں ایسی عفت مآب خواتین کا خیال بھی نہیں آسکتا۔"

بیشک خیال کیسے آئے، جب جو بی بی جتنی زیادہ بے باک و شوخ دیدہ ہو، اسی قدر حرز و بلند سمجھی جانے لگی ہے، اور جب کہ اعزاز کا معیار یہ ٹھہر گیا ہے کہ چہرہ کھلا رکھنے کے ساتھ ساتھ جسم نسوانی کی زیب و زینت کے حصے بھی زیادہ سے زیادہ بے پردہ ہو کر رہیں!

—— یہ ٹیلیفون تک سے شرمانے، لجانے والی خاتون آپ سمجھے کون تھیں؟ کوئی ان پڑھ دیہاتن نہیں، خود پڑھی لکھی، اور ہندوستان کے ایک تعلیم یافتہ انسان کی رفیقۂ حیات، بیگم مولانا ابوالکلام آزاد تھیں!

مولانا ابوالکلام خود اس باب میں بڑے شرمیلے اور سخت مشرقی واقع ہوئے تھے، مرحومہ کو ساتھ لے کر باہر گھومتے پھراتے تو خیر کیا، ان کا ذکر تک دوستوں کے سامنے پسند نہ کرتے۔ مدت دراز کے بعد ان مرحومہ زلیخا بی بی کے مختصر حالات ایک دوسری محترم خاتون حمیدہ سلطان دہلوی کے قلم سے ایک پرچہ میں نکلے، تو اتنا بھی پردہ اٹھا، ایک عفیفہ کا حال دوسری عفیفہ کی زبان سے سننے کے قابل ہے:

"..... دلآویز جسم، سفید سوتی باریک ساری بے پروائی سے لپیٹے، مشرقی حیا آمیز اداؤں کا قافلہ اپنے جلو میں لیے ہوئے میں نے اس دنیا کی حور کو دیکھا ہے۔ یہ پاکیزہ ہستی حضرت یوسف والی زلیخا نہیں۔ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کی رفیقۂ حیات زلیخا بیگم تھیں، ..... ان میں وہ تمام خوبیاں تھیں جو ایک اچھی خاتون میں ہونی ضروری ہیں، وہ سلیقہ شعار بھی تھیں، اور خانہ داری کے امور سے بھی بہ خوبی واقف، مہمان نواز بھی تھیں، اور ہنس مکھ شیریں زبان بھی،

سسرال والوں پر بھی جان چھڑکتی تھیں، اور شوہر پہ بھی فدا تھیں ... (ایک دن کی ملاقات) دس بجے کے بعد یہ ان کے ہاں پہنچیں، وہ خلاف عادت اس دن پندرہ منٹ بعد مسکراتی آئیں اور معانقہ کرتے ہوئے کہا، معاف کیجئے گا بہن، آپ کو اتنی دیر میرا انتظار کرنا پڑا، میں مولانا کو کھانا کھلا رہی تھی، وہ بہت تھوڑا اور سادہ کھانا کھاتے ہیں، دو چمچے اُبلے ہوئے چاول، تھوڑی دال، سبزی یا گوشت اور دہی ... ایک دن صبح جب ہم پہنچے تو بیگم آزاد کی نرگسی آنکھوں میں سرخ ڈورے دیکھ کر والدہ نے ان سے مسکرا کر کہا، کیا رت جگا ہے کیا بھاوج ؟ "آنکھیں گلابی ہو رہی ہیں" وہ ہنس کر بولیں، آپ کی تو عادت ہی بنانے کی، آج کل مولانا قرآن کی تفسیر لکھ رہے ہیں، رات کے دو بجے کے بعد اُٹھ بیٹھتے ہیں جتنی دیر وہ لکھتے ہیں میں پنکھا جھلتی ہوں، موسم بہت گرم ہے، اور باہر بھی حبس ہی رہتا ہے۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ جاگیں، محنت کریں اور میں آرام سے سوتی رہوں ... وہ انداز حجاب آج بھی مجھے یاد ہے کیسی باحیا بیوی تھیں، اور کیا زمانہ تھا کہ شوہر کا ذکر کرتی ہی شرماتی تھیں۔"

اللہ اللہ! ایک اتنے بڑے پبلک لیڈر کی بیوی کے لیے اس بیسویں صدی میں پردہ نشین رہنا خود ہی کیا کم جرم تھا۔ چہ جائیکہ اپنا وقت بجائے کلب اور بال روم اور سینما ہال میں صرف کرنے کے، اگلی جنتی بیویوں کی طرح شوہر کو کھانا کھلانا، ان کے پنکھا جھلنا، ان کے خیال سے راتوں کو خود اپنی نیند خراب کرنا، ٹیلیفون کو شوقیہ استعمال کرتے رہنے کے بجائے، نامحرم کے خیال سے اس کے سننے سے بھی احتیاط کرنا، اور کمال یہ کہ شوہر کا نام لیتے بھی شرمانا ایسی بی بی کو حق کیا تھا، آزادی اور بے باکی کی اس فضا میں زیادہ جیتے رہنے کا ؟ اچھا ہی ہوا۔ جو وہ جلد ہی جنت کے سفر پر روانہ ہو گئیں۔ اللھم اغفر لھا وارحمھا۔

(۳ /اکتوبر ۱۹۵۸ء)

مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط

مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام

مولانا دریابادی کے نام مولانا آزاد کے یہ خطوط پہلے "نیا دور" لکھنؤ میں چھپے، پھر اس سے صدق جدید (۹ دسمبر ۱۹۶۰ء تا ۱۰ فروری ۱۹۶۱ء) میں نقل ہوئے۔ بعدہٗ مولانا غلام رسول مہر نے انہیں "تبرکات آزاد" میں شامل کر لیا، اس کتاب کے موضوع کی مناسبت اور بحث کی تکمیل کے خیال سے انہیں یہاں شامل کر لیا گیا ہے۔ خطوط کے آغاز میں تمہیدی عبارت اور ہر خط کے آخر میں توضیحی اشارات مولانا دریابادی کے قلم سے ہیں۔ آخر کے پانچ مکمل و نامکمل خطوط جو اجمل خان صاحب کے قلم سے ہیں۔ (نمبر ۱۸ تا ۲۲) بعد میں دستیاب ہوئے تھے۔ "افادات آزاد" سے لے کر اس مجموعے میں شامل کر دیئے گئے۔

خالی معتقدین تو اپنے ہیرو کو عرش معلیٰ پر ہی پہنچا کر دم لیتے ہیں لیکن احتیاط و اعتدال سے بھی پورا کام لینے کے بعد، اتنا تو بہرحال ماننا ہی پڑتا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد اپنے معاصرین میں ایک بڑا ممتاز مرتبہ رکھتے تھے اور نہ صرف ذہنی، فکری، علمی، ادبی، بلکہ بعض اخلاقی کمالات کے بھی مالک تھے۔

ان کی پبلک تحریریں جس معیار کی ہیں وہ تو ظاہر ہی ہیں لیکن ان کی سیرت کے بعض جوہر ایسے ہیں جو ان کی خانگی یا نجی ہی تحریروں میں زیادہ چمکتے نظر آتے ہیں۔ ان کی مطبوعہ تحریروں سے الگ ہی نہیں بلکہ ایک حد تک ان سے بالکل مختلف۔ مثلاً

(۱) الہلالی دور کے مضمونوں اور مقالوں میں طنز و تعریض کا عنصر نمایاں و غالب

نظر آئے گا۔ لیکن عین اسی زمانہ کے مکتوبات میں یہ عنصر نام کو بھی نہیں نظر آتا اور مولانا (ایڈیٹر الہلال سے الگ) تمام تر سادگی، سنجیدگی کی تصویر نظر آتے ہیں۔

(۲) اس دور کے مضمون اور مقالے جوشِ خطابت اور شعلہ بیانی کی نذر ہیں۔ مکتوبات میں اس کے برعکس، مولانا بجائے ایک جذباتی انسان کے ہر طرح متوازن ومعتدل اور ٹھنڈے دل سے غور وفکر کرنے والے انسان کے روپ میں جلوہ گر ہیں۔

(۳) نکتہ چینیوں کو اس دور کی مطبوعہ تحریروں میں بوئے انانیت محسوس ہوتی ہے، ذاتی خطوط کا نقشہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں جلوہ آرائیاں تواضع، انکسار و اخلاص ہی کی ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ پختہ عمری کے بعد مولانا کی پبلک تحریروں میں بھی یہ رنگ ایک حد تک آچلا تھا، پھر بھی یہ رنگ نمایاں خطوط ہی میں ہے اور ابتدائی اور درمیانی دور کی مطبوعہ تحریریں تو بالکل ہی دوسرے رنگ کی ہیں۔

انسان کے ظرف کا صحیح اندازہ کرنا ہو تو یہی دیکھنے پر قناعت نہ کیجیے کہ اس کا برتاؤ دوستوں اور معتقدوں کے ساتھ کیسا ہے۔ بلکہ یہ دیکھیے کہ معترضوں، نکتہ چینوں اور مخالفوں کے ساتھ کیسا ہے۔ یہ امتحان ایک کڑا امتحان ہے۔ اچھے اچھے عابد و زاہد بزرگ بھی اس امتحان میں ہمیشہ پورے نہیں اتر پاتے۔ مولانا کو اللہ نے اس نعمت خصوصی سے نوازا تھا کہ وہ اپنے مخالفین کے لیے بھی دل میں جگہ رکھتے تھے اور ان سے معاملہ رکھنے میں اپنے حلم، رواداری اور عالی ظرفی کا پورا ثبوت دیتے رہتے۔

ان حالات میں یہ کچھ ضروری سا معلوم ہوا کہ مولانا کے یہ نجی خطوط جو تعداد میں بہت تھوڑے ہیں دنیا کے سامنے پیش ہو جائیں گو ان میں بعض ایسے بھی ہیں جن سے خود مکتوب الیہ کی خودستائی کا پہلو نکل رہا ہے۔

(۱)

الہلال۔ کلکتہ

۷۔ امپکلاوڈ اسٹریٹ کلکتہ
۱۲ر اگست ۱۹۱۲ء

صدیقی العزیز!
والانامہ پہنچا۔ آج صبح مہلت ملی تو عین صبح کے وقت کہ ذہن و دماغ کے سکون اور جمعیت کا وقت ہوتا ہے اوّل سے آخر تک پڑھا یقین فرمائیے۔ کہ اس مخلصانہ اظہار رائے و مشورہ کے لیے کمال متشکر اور ممنون ہوں۔

میں آج ہی تفصیلی طور پر اپنی معروضات بھی عرض کرتا لیکن خود بیمار ہوں۔ گھر میں شب سے سخت علالت ہے دو چار دن کی مہلت دیجیے۔ انشاء اللہ جمعرات یا جمعہ کے دن خط لکھوں گا۔

آپ کا پتہ مجھے معلوم نہ تھا۔ مولانا شبلی یہیں مقیم تھے ان سے پوچھا تھا اور خط لکھنے کا ارادہ کر رہا تھا۔

مولانا شبلی کی بھی الہلال کے لب و لہجہ کی نسبت وہی رائے ہے جو آپ کی ہے۔

فقیر ابوالکلام

مولانا کے محفوظ خطوں میں یہی سب سے پہلا خط ہے۔ مکتوب الیہ اس وقت بی اے پاس کر کے ایم اے میں (فلسفہ لیکر) داخل ہونے کی فکر میں تھا اور اس وقت مسلمان طالب علم کے لیے یہ ایک حد تک نئی سی بات تھی۔
الہلال کو نکلے ہوئے ابھی تھوڑا ہی زمانہ ہوا۔ علی گڑھ کے خلاف اس کی شدید اور تند پالیسی سے مکتوب الیہ متفق نہ تھا اور یہی مولانا کو مفصل خط میں لکھ بھیجا تھا۔
مولانا شبلی تو علی گڑھ کی سیاسیات کے خود ہی بہت مخالف تھے تاہم الہلال کی تندی

تک جانے کو تیار نہ تھے۔

صاحب الہلال کا مرتبہ اس وقت بھی بلند تھا۔ یہ ان کا نہایت کرم تھا کہ ایک طالب علم سے وہ مساویانہ لہجہ اختیار کیے ہوئے تھے۔
لفظ ''صدیقی'' جس سے یہ مکتوب شروع ہوا ہے، اور آئندہ بھی عموماً اسی سے سارے مکتوب شروع ہوتے رہیں گے۔ عربی کا لفظ صَدیق بروزن فَعیل وکریم ہے نہ کہ اردو میں چلا ہوا لفظ صِدّیق (دال مشدّد کے ساتھ) اور اس کے معنی دوست کے ہیں۔

(۲)

الہلال۔ کلکتہ

۷۔ امیکلاوڈ اسٹریٹ۔ کلکتہ

۷۔ دسمبر ۱۹۱۲ء

صدیقی العزیز!

سخت نادم ہوں کہ خط کا جواب وقت پر نہ دے سکا۔ خواستگار معافی۔
امید ہے کہ آپ بہ صحت و عافیت ہوں گے۔ یہ سن کر نہایت خوشی ہوئی کہ آپ نے ایم اے میں فلسفہ لیا ہے، نیز تحصیل زبان جرمن۔
مولوی عبدالقادر صاحب خط کا جواب نہیں دیتے امرتسر میں نے خطوط لکھے اور عرصے تک انتظار کیا۔ میرا سلام پہنچا دیجیے۔

ابوالکلام

مکتوب الیہ لکھنؤ چھوڑ کر اب علی گڑھ پہنچا ہے (لکھنؤ میں ایم اے میں فلسفہ کی تعلیم کا انتظام نہ ہو سکا) علی گڑھ میں پروفیسر ہوروئز (جرمن یہودی و مستشرق) سے جرمن زبان میں کچھ شُد بُد شروع کر دی تھی اور وہ شُد بُد آگے بڑھی ہی نہیں۔

مولوی عبدالقادر بھاگلپوری بھی ایم اے ہی کے طالب علم تھے فلسفہ میں کوئی اور

مضمون لیے ہوئے۔ مسلک قادیانی (احمدی) رکھتے تھے اور مولانا ابوالکلام آزاد اُن کے علم ونظر کے مداحوں میں تھے۔

(۳)

۲۶ رمئی ۱۹۱۲ء

دیر آمدی اے نگار سرمست
زودت ندہم دامن از دست

صدیقی العزیز!

عطیۂ گرامی کا شکریہ۔ حسب الارشاد دو نمبروں میں شائع ہو جائے گا۔

کیا آپ اس کو پسند فرمائیں گے کہ البصائر کے لیے جو ایک ماہوار غیر سیاسی خالص علمی و دینی پرچہ ہوگا جو جولائی سے شائع ہو جائے گا۔ کوئی مضمون مخصوص ارقام فرمائیں؟ کسی اہم علمی موضوع پر ہو اور ترجمہ ہو یا بطور خود۔

ایک مستقل کتاب کے زیر ترتیب ہونے کی خبر پڑھ کر خوشی ہوئی۔

البصائر کے لیے مضمون ۱۵ ر جون تک ضرور مل جانا چاہیے۔ پہلا نمبر مدت سے مرتب ہے۔ صرف بعض ابواب باقی ہیں۔

مخلصکم الوفیٰ
ابوالکلام

جناب عبدالماجد بی اے۔ اسکوائر
گھسیاری منڈی۔ لکھنؤ

"مستقل کتاب" سے اشارہ مکتوب الیہ کی "فلسفہ جذبات" کی جانب ہے۔ اس کتاب کا ایک باب دو نمبروں میں چھپنے کے لیے الہلال کو پیش کیا گیا تھا۔ الہلال نے اسے چھاپا تو لیکن بعض مصطلحات پر ایک تنقیدی نوٹ دے کر، جس کا لہجہ مولانا کے مکتوب کے محبت آمیز لہجہ سے بالکل مختلف تھا۔

البصائر کا نکلنا اس وقت یاد نہیں پڑ رہا ہے۔ (اس کے اجرا کی نوبت

نہیں آئی - ابو سلمان)

(۴)

۲۳ ستمبر ۱۹۱۳ء

صدیقی العزیز!

آپ کا مضمون پہنچا لیکن آپ نے کسی قدر جلدی کی - میری تحریر ناتمام ہے - میں اسے بجنسہ الہلال میں شائع کر دوں گا مگر اپنی بقیہ تحریر کے ساتھ یا بعد -

آپ کے غصہ نے بڑا لطف دیا -

لکھنؤ میں مولوی ظفر حسن صاحب کے متعلق آپ سے گفتگو ہوئی تھی اور یہ بات قرار پا گئی تھی کہ وہ کچھ دنوں کے لیے آ کر یہاں ٹھہریں لیکن پچھلے دنوں ان کا ایک خط مراد آباد سے آیا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ انہیں اس قرار داد کی کچھ خبر نہیں - اب غالباً وہ لکھنؤ میں ہوں گے - جو گفتگو آپ سے ہوئی تھی وہ ان سے فرما دیجیے - اب تک اس کا پورا موقع باقی ہے کہ وہ تشریف لائیں -

ہاں یہ آپ کو معلوم ہے کہ آج کل مسلم گزٹ کا اڈیٹر کون ہے؟

ابوالکلام

الہلال کے تنقیدی نوٹ کے جواب میں ادھر سے بھی ایک مضمون ترکی بہ ترکی لکھا گیا تھا - مکتوب میں مکتوب الیہ کے غصہ کا حوالہ اسی جوابی مضمون کے سلسلہ میں ہے -

ظفر حسن خاں سے مراد ہیں آج کے خان بہادر ظفر حسن خاں، ریٹائرڈ انسپکٹر آف اسکولز اور ریٹائرڈ پرنسپل شیعہ کالج لکھنؤ ــــ لکھنؤ کیننگ کالج میں مکتوب الیہ کے خصوصی دوستوں میں تھے - اور اسی کے توسط سے مولانا سے ملے تھے، جب وہ سول اینڈ ملٹری ہوٹل (آج کے برلنگٹن ہوٹل) لکھنؤ میں مقیم تھے - مولانا انھیں الہلال کے اسٹاف میں لینے کو آمادہ تھے -

مسلم گزٹ اس وقت لکھنؤ کا ایک مشہور ہفتہ وار تھا - مولوی محمد وحید الدین

سلیم پانی پتی کی ادارت میں نکلتا تھا۔

(۵)

۱۵ / اکتوبر ۱۹۱۳ء

صدیقی العزیز!

آپ کا خط پہنچا۔ یہ تو میں نے پیشتر ہی آپ کو لکھ دیا تھا اور اجازت طلب کی تھی کہ مضمون کی اشاعت میں تاخیر ہو گی اور لکھا تھا کہ میں اپنی تحریر کے اختتام کے بعد جو نمبروار چھپ رہی ہے اسے درج کروں گا چنانچہ اس کی نسبت آپ نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ ادھر میں اور معاملات میں اس طرح مصروف رہا کہ بقیہ مضمون کے لکھنے کا موقع ہی نہیں۔ بانکی پور چلا گیا تھا وہاں سے واپس ہوا اور بیمار ہوں۔ بس آپ کی تحریر آئندہ اشاعت میں بھی نہیں ہے۔ اس کے بعد کی اشاعت میں شائع ہو گی مع میرے مضمون کے تیسرے آخری نمبر کے۔ رہا یہ کہ آپ اس کو دوسرے اخبارات میں شائع فرمائیں گے۔ تو شاید میں نے اب تک کوئی کوشش اس طرح کی نہیں کی ہے کہ لوگ اپنے مضامین الہلال کے سوا دیگر رسائل میں شائع نہ کریں۔ یہ آپ کے لیے جس طرح اس وقت ممکن تھا جب آپ نے وہ تحریر مجھے بھیجی، اب بھی ممکن ہے اور آئندہ بھی ممکن رہے گا۔ آپ جس اخبار میں شائع کرنا چاہیں، شائع فرما دیں مجھے تو کوئی عذر نہیں البتہ بصورت عدم اشاعت، سامنے بدھ کے بعد والے بدھ کو الہلال میں درج ہو سکے گی اور بصورت اشاعت اس کا تذکرہ بحوالہ اخبار شائع کنندہ۔

آپ کو معلوم نہیں مراسلات وغیرہ الہلال میں ہمیشہ تاخیر سے شائع ہوتے ہیں۔ کئی مضمون ایک ایک ماہ کے بعد نکلے ہیں، یہ بدنظمی ہو یا سوءِ قصد لیکن ایک عام بات ہے۔

مسلم گزٹ تو بالآخر بند ہی ہو گیا لیکن افسوس ہے کہ بے موقع اور بہت ہی بُری طرح۔ مولوی ظفر حسن صاحب کا خط آیا انہوں نے اپنی موجودہ حالت جو بیان کی ہے۔ مجھے ہمدردی ہے۔ خدا انہیں کامیاب فرمائے۔ ایسی صورت میں تو واقعی ان کا تشریف

لانا مشکل معلوم ہوتا ہے۔

ابوالکلامؒ

مکتوب کے بیشتر حصّہ میں تذکرہ اس ناخوشگوار مناظرانہ رنگ کے سلسلۂ مضامین کا ہے۔ اب بات کتنی ہلکی بلکہ بے حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ اس وقت مرکز اہمیت بنی ہوئی تھی۔

مسلم گزٹ سرکاری عتاب کی زد میں آکر بند ہوگیا تھا۔ سلیمؔ صاحب کے ہٹ جانے کے بعد اس کے اڈیٹر بریلی کے ایک پرجوش اور دردمند مسلمان، مولوی ابوالکمال عبدالودود وارد ہوگئے تھے۔ مولانا شبلی اس کے قبل ہی اس کی سرپرستی سے دست کش ہوچکے تھے۔

ظفرحسن خاں صاحب کے والد کا دفعتہً انتقال ہوگیا تھا۔ اور وہ اپنی ذاتی وخانگی پریشانیوں میں مبتلا تھے۔

(۶)

۱۵ر مارچ ۱۹۱۸ء

صدیقی العزیز! السلام علیکم

یاد فرمائی کے لیے ممنون و شکرگزار اور تاخیر کے لیے خواستگار معافی ہوں۔ اُمید کہ معذرت مقبول ہوگی۔ عثمانیہ یونیورسٹی اگر وجود میں آگئی تو بلاشبہ موجودہ زمانہ میں ہندوستان کا سب سے بڑا علمی کام ہوگا البتہ جیسا کہ آپ نے لکھا ہے اشخاص کی کمی ہے اور ضرور ہے کہ کچھ عرصہ تک مطلوبہ نتائج پیدا نہ ہوں۔ لیکن ابتدا میں کوئی کام بھی بلا انتظار وتدریج متوقع نتائج پیدا نہیں کرتا کام صحیح اور مفید ہونا چاہیے نقائص رفتہ رفتہ دور ہوجائیں۔ عدم سے وجود مع النقائص بہرحال بہتر ہے اور اشخاص کے فقدان کا بھی علاج یہی ہے کہ کام ہو آپ نے لکھا ہے کہ سردست صرف معمولی درجہ کی فلسفہ و منطق کی کتابوں کو لکھنا پڑتا ہے اور اس لیے طبیعت لگتی نہیں۔ لیکن یہ تو ناگزیر ہے اور ترتیب مبادیات و اوائل کا کام بھی منتہیوں ہی کو کرنا پڑے گا مبتدیوں کے

لیے چھوڑا نہیں جاسکتا۔ اگر آپ کے قیام و تعلق سے عثمانیہ یونیورسٹی نے اتنا ہی فائدہ حاصل کیا کہ ہر فن میں مبادیات کا سلسلہ مکمل ہوگیا تو کیا یہ کوئی چھوٹا کام ہے۔

آپ نے فلسفہ کے ساتھ منطق کا بھی ذکر کیا ہے۔ منطق میں مولوی نذیر احمد مرحوم کا رسالہ مبادی الحکمۃ ہر لحاظ سے بہت عمدہ ہے اور بیان مسائل میں اس وجہ کا ہے کہ ہمارے قدیم عربی نصاب کے ابتدائی رسائل ایسا غوجی وغیرہ سے لے کر قطبی تک کا قائم مقام ہوسکتا ہے اور حسن بیان و تعبیر و ترتیب و امثلہ کے لحاظ سے بدرجہا ان پر فائق۔ انگریزی کا حال مجھے معلوم نہیں ضرورت اس کی ہے کہ اس کے بعد کا صرف ایک رسالہ سردست اور مرتب کیا جائے مجوزہ یونیورسٹی میں ہمارے عربی مدارس کی طرح منطق ابتداہی میں نہیں رکھی جائے گی۔ بلکہ جدید نظام تعلیم کے مطابق، ابتدائی سنین تعلیم کے گزر جانے کے بعد اور اس وقت کے لیے مبادی الحکمۃ بہت اچھی پہلی کتاب ہے۔

لیکن یہ صرف مقدمات و مسائل تک ہے۔ مباحث کے لیے اس کے بعد کی دوسری کتاب تیار کرنی چاہیے۔ متعدد چھوٹے چھوٹے رسائل مفید ہوں گے۔

آپ نے لکھا ہے کہ "تین چار سال ادھر شاید بعض غلط فہمیوں کی بنا پر دلوں کی صفائی میں زنگ آگیا تھا" آپ نے دل کے لیے جمع کا صیغہ استعمال کیا ہے، حالانکہ ہونا چاہیے مفرد۔ میں آپ کو پوری سچائی کے ساتھ یقین دلاتا ہوں کہ میرے حافظہ میں کوئی گذشتہ زمانہ ایسا موجود نہیں ہے جس میں آپ کی جانب سے میرا قلب زنگ آلود رہا ہو۔ دنیا میں باہمی علائق کے تکدر کے مختلف اسباب ہوا کرتے ہیں۔ میں بالکل نہیں جانتا کہ اس قسم کا کون سبب پیدا ہوگیا تھا، کیا اس پورے زمانہ میں آپ نے کوئی بات میری جانب سے دیکھی یا سنی؟

میں نے تو جب کبھی کوئی بات۔ مولانا شبلی مرحوم یا بعض دیگر حضرات سے نقلاً سنی تو خدا شاہد ہے کہ اس کا کوئی اثر اپنے قلب میں حسب عادۃ محسوس نہ کیا بلکہ اس کو کسی ایسے سبب پر مبنی خیال کیا جو مجھے معلوم نہیں۔ اس طرف سے جناب بالکل مطمئن

رہیں۔ ہیں آپ کے جن اوصاف کا علماً یقین کرتا ہوں اور جو باعث نیاز مندی ہو سکتے ہیں۔ جب تک ان میں تغیر نہ آئے میری نیاز مندی متغیر نہیں ہو سکتی ایسے تو الحمدللہ مجھ کو کوئی وجہ شکایت نہیں لیکن اگر ہوتی بھی تو انشاءاللہ آپ مجھ کو کبھی شاکی نہ پاتے

بہ یُمن عشق زکونین صلح کل کردیم
تو خصم باش و زما دوستی تماشا کن

آپ کی توجہ فرمائی بالکل مخلصانہ اور بے لاگ ہے موجودہ حالات میں کہ نظر بند و معتوب حکومت ہوں، آپ کے لیے کوئی وجہ مراسلت نہیں ہو سکتی تھی۔ الا یہ کہ مخلصاً و بے غرضانہ لطف و نوازش، و مقتضائے خُلقِ طبع، اس بات کو محسوس کرتا ہوں اور ممنون و متشکر ہوں۔

آپ نے جناب مولانا حمید الدین کا ذکرِ خیر فرمایا ملاقات ہو تو اس دُور افتادہ کا سلام شوق عرض کر دیں۔

معارف آتا ہے نہایت شوق و دلچسپی سے مکالمات برکلے کا سلسلہ پڑھ رہا ہوں اور آپ کے حسن بیان و قوت نقل علوم و تسہیل مطالب کی تعریف نہیں کر سکتا آپ انشاءاللہ اُردو کے لیے وہ کام کریں گے جو اب تک کسی سے نہیں ہوا یعنی نقل علوم۔ سرسید مرحوم کے مجمع نے اُردو کی عظیم الشان خدمتیں انجام دیں لیکن اس مد میں اب تک کچھ نہیں ہوا۔ حکیم عباری صاحب تصورات کلیہ بھی اس بارے میں اتنی ہی مدح کے مستحق ہیں جس قدر کہ آپ۔

فقیر ابوالکلام

۱۵ مارچ ۱۹۱۸ء۔ رانچی (بہار)

الہلال مدت ہوئی بند ہو چکا ہے۔ اور مولانا اب عرصہ سے رانچی (صوبہ بہار) میں نظر بند ہیں۔ پہلی جنگ عظیم ابھی جاری ہے۔

مکتوب الیہ یکم ستمبر ۱۹۱۷ء سے حیدرآباد آگیا ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی ابھی باقاعدہ نہیں کھلی ہے۔ لیکن اس کا مقدمۃ الجیش سررشتہ تالیف و ترجمہ مولوی عبدالحق صاحب (جو اب بابائے اُردو کے نام سے مشہور ہیں) کی نظامت میں قائم ہو چکا ہے۔ اور

مکتوب الیہ کے سپرد شعبۂ فلسفہ و منطق ہے۔

۱۳ءء میں جو تلخ و تند مباحثہ الہلال کے صفحات میں، محض بعض اصطلاحات کے پیچھے ہو پڑا تھا اب مکتوب الیہ کو اس پر ندامت و تاسف تھا۔ اور اپنے خط میں مولانا سے معذرت کی تھی ـــــ مولانا نے جواب میں جو شریفانہ انداز اختیار کیا۔ اور لطف و نوازش کی جو بارش کی، اس سے مکتوب الیہ پانی پانی ہو گیا۔

ماہنامہ معارف (اعظم گڑھ) میں مکتوب الیہ کے قلم سے، انگلستان کے فلسفی بشپ بارکلے کے مکالمات (Dialogues) کا ترجمہ نکل رہا تھا۔ مولانا نے حوصلہ افزائی اس کی فرمائی ہے۔

مولانا حمید الدین صاحب فراہی اعظم گڑھی (صاحب تفسیر القرآن عربی) اس وقت تک حیدرآباد میں دار العلوم کالج کے صدر تھے۔

عباری سے مراد ہیں مولانا عبد الباری ندوی۔ وہ اردو میں فلسفی بارکلے کے مکالمات کو اردو میں معارف کے صفحات میں لا رہے تھے "تصورات کلیہ" کے عنوان سے۔

(۷)

۱۶ مارچ ۱۹۱۸ء

صدیقی العزیز! السلام علیکم

کل خط بھیج چکا ہوں لیکن ایک غلطی ہو گئی جو آپ کو حیران کر دے گی کل ایک خط بمبئی کے ایک تاجر کتب کے نام بھی لکھا تھا اور اس کو فہرست کی قیمت ۵ ر بھیجنی تھی۔ غلطی سے ۵ ر کے ٹکٹ آپ کے خط میں رکھ دیے گئے اور اس کا خط یہیں پڑا رہا آپ حیران ہوں گے کہ یہ ٹکٹ کیوں بھیجے گئے۔

فقیر ابو الکلام ـ رانچی بہار ۱۶ مارچ ۱۹۱۸ء

ظاہر ہے کہ یہ مکتوب نمبر (۶) کا محض ضمیمہ ہے۔

(۸)

۲۷ جنوری ۱۹۱۹ء

صدیقی العزیز! السّلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

یاد فرمائی کا شکریہ۔ یہ آپ نے خوب کیا کہ حیدر آباد سے کنارہ کش ہو گئے۔ اول تو علمی زندگی ملازمت کے ساتھ نبھ نہیں سکتی، پھر ملازمت بھی دیسی ریاستوں کی، اور ریاست بھی حیدر آباد جیسی سازش کدہ، عثمانیہ یونیورسٹی کا ابھی نیا نیا غلغلہ ہے۔ چند دنوں کے بعد دیکھیے گا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ آپ نے اپنی ایک تصنیف کا ذکر کیا تھا۔ غالباً اس سے فارغ ہو چکے ہوں گے۔

یہ تکفیر کا معاملہ بہت ہی دلچسپ رہا۔ مجھ کو امید نہ تھی کہ آپ اس قدر جلد مسلمان ثابت ہو جائیں گے۔ اگرچہ کفر کا مقام اس سے ارفع ہے۔

کافر نتوانی شد لاچار مسلمان شو"

امید ہے کہ آئندہ آپ اس طرح کے علائق سے آزاد و کنارہ کش رہیں گے، اور آزادانہ و خود مختارانہ اپنے اشغال میں منہمک و مستغرق۔ اگر ایسی زندگی میسر آئے تو اس سے بہتر و کامیاب زندگی کوئی نہیں۔

ابوالکلام

مولانا ابھی تک بدستور رانچی میں نظر بند ہیں۔

مکتوب الیہ تقریباً ایک سال کی مدت پوری کر کے حیدر آباد سے لکھنؤ واپس چلا آیا ہے۔ اور ملازمت سے استعفا دے آیا ہے۔ مکتوب الیہ کا رنگ حیدر آباد کے شاہی ماحول میں بالکل نہ لگ سکا تھا۔ وہاں کے بہت سے بزرگوں، دوستوں، عزیزوں کی انتہائی خاطر داریوں کے باوجود مکتوب الیہ کی ایک کتاب نفسیات اجتماعی کے موضوع پر دو تین سال قبل کی چھپی ہوئی تھی۔ اس میں مذہب پر جا بجا حملے تھے۔ (اور خود الہلال پر بھی جا بجا چوٹیں تھیں) حیدر آباد میں اس پر ایک ہنگامہ تکفیر برپا ہو گیا تھا۔ مکتوب الیہ انگریزیت کے اثر سے واقعتہً اس وقت در عقلیت "

اور الحاد میں بتلا تھا - از سر نو مسلمان اس کے ایک عرصہ کے بعد ہوا -

(۹)

۲۶ ر نومبر ۱۹۱۹ء

صدیقی العزیز السلام علیکم

مدت کے بعد آپ کا خط آیا، خوش وقت فرمایا۔ "تذکرہ" کوئی ایسی چیز نہ تھی جو خصوصیت کے ساتھ شائع کی جاتی، ایک صاحب نے بطور خود شائع کر دیا - بوجوہ اس کی اشاعت میرے لیے خوش آئند نہ ہوئی -

حقیقت کے کئی نمبر آچکے ہیں - آپ کے خط کے بعد خصوصیت سے میں نے دیکھا، بلا تامل کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت یہ سب سے اچھا ویکلی اردو اخبار ہے - اگر استقلال کے ساتھ جاری رہا اور مذاقِ عوام کی پیروی نہ کی گئی تو یہ ایک بڑی ضرورت پوری کرے گا -

آپ نے لکھا ہے کہ تعطل کا زمانہ کیوں نہ تمدنی اصلاحات کی سعی میں بسر کیا جائے؟ لیکن زمانہ تعطل کی قید کیوں؟ یہ کام تو ایسا ہے کہ بڑی بڑی طاقتور کارگن زندگیوں کو وقف ہو جانا چاہیے - جس چیز کو لوگ سیاسی اصلاح و ترقی کہتے ہیں وہ بھی دراصل تمدنی اصلاحات و ترقیات کی ایک خاص مجتمعہ حالت ہی سے عبارت ہے - سیاست مصطلحہ کا اس سے باہر کوئی وجود ہی نہیں - اور جس قدر بھی جماعتی مطلوبات ہیں - بغیر درستگی علم و عمل افراد و حصول حقوق معاشرت و مدنیۃ ممکن نہیں - بہر حال ایسا ضرور ہونا چاہیے - لیکن آپ نے جس مسئلہ کی نسبت لکھا ہے وہ صرف پنجاب و بمبئی کی بعض اقوام سے تعلق رکھتا ہے - یعنی مسئلہ توریث میں رواج اور ہندو لا پر عمل کرتے ہیں اس کے علاوہ بھی کچھ مسائل پیش نظر ہوں تو تحریر فرمائیے - میں حقیقت کے لیے ضرور لکھوں گا -

مولانا سید سلیمان صاحب دو بار لطف فرما چکے ہیں - انجمن کے جلسہ کے موقع پر بھی تشریف لائے تھے - آپ کی ملاقات کی یاد آتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صدیاں

گزر گئیں۔

ابوالکلام رانچی ۲۶ نومبر ۱۹ء

"تذکرہ" سے مراد خود مولانا کی مشہور و معرکتہ الآرا کتاب "تذکرہ" ہے۔ نئی نئی شائع ہوئی تھی، اور اس کا بڑا غلغلہ تھا۔ مکتوب الیہ نے اسے کہیں پڑھ کر اس پر اپنی رائے لکھ بھیجی تھی۔

مکتوب الیہ اب لکھنؤ میں ہے اور آزاد ہے۔ مولوی ظفر الملک علوی کاکوروی مرحوم کی شرکت سے اور اپنی نگرانی میں اس نے ایک ہفتہ وار پرچہ "حقیقت" نامی شروع کرایا ہے۔ ایک عرصہ کے بعد ظفر الملک مرحوم اور مکتوب الیہ دونوں اس سے الگ ہو گئے اور پرچہ تمام تر انیس احمد صاحب عباسی کے ہاتھ میں آگیا۔ جس زمانہ میں مولانا نے یہ داد لکھ کر بھیجی ہے۔ مکتوب الیہ ہی کی نگرانی میں نکلتا تھا۔

مکتوب الیہ نے یہ بھی لکھا تھا کہ سیاسی کام سے تو آپ کی معذوری ظاہر ہے لیکن مسلمانوں کے اور اصلاحی کام تو اس وقت بھی آپ کر سکتے ہیں۔

مکتوب الیہ کی شدت الحاد اب باقی نہیں رہی تھی، اور اب وہ اسلام سے قریب تر آتا جا رہا تھا۔

(۱۰)

۳ جنوری ۱۹۲۰ء

صدیقی العزیز!

مسئلہ توریث میں یوپی کے مسلمانوں کا حال معلوم نہ تھا آپ کے خط سے معلوم ہوا جن مفاسد کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے۔ وہ اور اسی طرح کے بے شمار مفاسد ہیں۔ جن کی اصلاح مقدم ترین امور میں سے ہے۔ لیکن اس کے بارے میں سب سے پہلا سوال طریق اصلاح کا ہے۔ کسی جماعت کے رسم و عوائد اور صدیوں کی مالوفات میں تبدیلی پیدا کرنا ایک ایسا کام ہے جو صرف بحث و نظر سے کامیاب نہیں ہو سکتا۔ یعنی محض دلائل و معلومات

کی اشاعت اس کے لیے سودمند نہیں ہو سکتی۔ جہاں تک تعلق احساس و اعترافِ مفاسد اور معلوماتِ مانعہ کا ہے، بہت کم تعلیم یافتہ آدمی ایسے نکلیں گے جو ان سے بے خبر ہوں، یا ضرورتِ اصلاح سے اختلاف رکھتے ہوں۔ تاہم یہ طاقت کسی میں نہیں ہے کہ عملاً اپنے اندر تبدیلی پیدا کرے اور داعیات و بواعثِ مفاسد کا عزم و ہمت سے مقابلہ کرے آپ جانتے ہیں کہ تمام فضائل عملیہ کا یہی حال ہے۔ مجرد بحث و نظر سے یہ مرحلہ نہ کبھی طے ہوا ہے نہ ہوگا۔ مفاسدِ معاشرت میں بڑا حصہ ایسے رسوم و اعمال کا ہے جو شرعاً بھی داخل اشد معاصی و فسق، اس لیے کم سے کم ان کے لیے تو علماء و مشائخ کو ضرور سعی کرنی چاہیے۔ مگر جو حال علماء کا ہے، آپ کو معلوم ہے۔ علماء غیر علماء سے نفس معلومات میں ممتاز ہیں۔ عمل میں نہیں۔ مفاسد کے دواعی و ترغیبات جس طرح عوام کے لیے قہر و تسلط رکھتی ہیں، ان کے لیے بھی، اس لیے باوجود علم وہ خود بھی مبتلا نظر آتے ہیں۔

ضرورت اس کے لیے دو باتوں کی ہے، ایک، تو سعی اصلاح کے ساتھ ساتھ دفع و انسداد دواعی و ترغیبات کی بھی کوشش کرنی چاہیے۔ جب تک ان محرکات کا دفعیہ نہ ہوگا جو مفاسد کے لیے باعث ہیں، مجرد ترک و منع کی دعوت سودمند نہیں ہو سکتی۔ آپ لوگوں سے کہتے ہیں۔ گرد و غبار سے بچو اور سڑک پر چھڑکاؤ کا انتظام نہیں کرتے۔ ثانیاً ایک ایسی جماعت کا وجود، اور منظر عام پر آجانا جو عملاً اصلاح کا نمونہ ہو اور اصلاح کا وجود خارج میں مجسم و ممثل دکھا دے۔ چند عازم انسانوں کا فعل نفوذ اخبارات کے سیکڑوں آرٹیکلوں سے زیادہ اثر رکھتا ہے۔ اگر ایک چھوٹی سی جماعت بھی اصلاح و تغیر کے چند ممتاز خصائص کے ساتھ قائم ہو جائے تو چند سالوں کے اندر تمام قوم کی حالت بدل جائے۔ علی الخصوص انگریزی تعلیم یافتہ جماعت جس میں احساسِ حال اور طلبِ اصلاح کی استعداد سب سے زیادہ موجود ہے۔

آپ تصنیف و تالیف میں علم اور سعی و عمل میں اصلاحِ معاشرت، ان دو چیزوں کو اپنا مطمح نظر بنائیے۔ پہلی بات تو موجود ہے، دوسری کے لیے بھی آمادہ ہو جائیے۔ اپنے تعلیم یافتہ احباب میں سے چند عزم صادق رکھنے والے اشخاص منتخب کیجیے۔ اور ایک انجمن قائم کیجیے

ابتدا میں صرف دو چار نہایت ضروری اور بنیادی باتیں لے لی جائیں اور صرف ان لوگوں کو شریک کیا جائے جو ان پر پوری طرح عمل کرنے کے لیے تیار ہوں اور تمام موانع کا مردانہ وار مقابلہ کریں۔ کوئی ایسی جماعت وجود میں آجائے تو پھر اخبارات کے مباحث مفید ہو سکتے ہیں ورنہ مجرد مضامین نویسی سے اردو میں معاشرتی مباحث کا ایک نیا لٹریچر فراہم ہو جائے گا، عملاً اصلاح نہیں ہو سکتی۔ لوگوں کو ایک ایسی زندگی بسر کرنے کی دعوت دینا جس کے خصائص و اعمال کا ذہن سے باہر کوئی وجود نہیں، معاشرت کا فلسفہ ہے، اصلاحِ معاشرت نہیں ہے۔

تاہم مقصود یہ نہیں کہ مضامین نہ لکھے جائیں۔ ان کی ضرورت سے انکار نہیں۔ بہرحال بہتر ہے۔ میں حقیقت کے لیے ضرور لکھوں گا لیکن براہِ عنایت حاجی بغلول اور تجاہل عارفانہ وغیرہ کو تو رکوائیے یہ کیا مصیبت ہے۔ اگر یہی حال رہا تو وہی ہمدرد وغیرہ کا حال ہو کر رہ جائے گا۔

والسلام علیکم۔ دیکھیے آپ سے کب ملاقات ہوتی ہے۔

ابوالکلام رانچی ۲ر جنوری ۲۰ئہ

اس طرح کے مکتوبات سے مولانا کے اصولِ زندگی کے بہت سے گوشوں پر خوب روشنی پڑ جاتی ہے۔

"حقیقت" سے مکتوب الیہ کا تعلق ختم ہوتا جا رہا تھا۔ اس میں عام پسند ظرافت و مزاح کے خاصے عنوانات اب ہونے لگے تھے۔

(۱۱)

البلاغ۔ کلکتہ

۲۷ر جنوری ۱۹۲۰ء

صدیقی العزیز!

آپ کا خط رانچی میں ملا تھا۔ معافی خواہ ہوں کہ جواب میں تاخیر ہوئی۔ کلکتہ میں ایک ہی دن قیام کر سکا پھر دہلی چلا گیا اب واپس آیا ہوں۔ خط میں آپ نے اپنی علمی خدمات کے ساتھ عملی اقدام کے لیے بھی جو مستعدی ظاہر فرمائی ہے اس سے طبیعت نہایت درجہ

مسرور ہوئی - کاش اس کا جلد ظہور ہو - ہمراہیوں کا انتظار بے سود ہو گا - سب سے پہلا اور سب سے بہتر رفیق خود اپنا ارادہ اور یقین ہے - آپ نے مسٹر محمد علی کی شعلہ بیانی کی نسبت جو کچھ لکھا ہے بالکل متفق ہوں اور اتنا اس پر اضافہ کرتا ہوں کہ اگر ایک شخص اپنی ہتھیلی کے لیے انگاروں ہی کو منتخب کرتا ہے تو خیر، یہ بھی ایک راہ ہے - بشرطیکہ جلد پھینک نہ دے - بہر حال وہ ایک بڑی آزمائش سے کامیاب نکلے ہیں اور ان کی بڑی سے بڑی اور زیادہ سے زیادہ عزت کے لیے یہ بس کرتا ہے -

دیکھیے آپ سے کب ملاقات ہوتی ہے - رانچی میں نہیں تو کلکتہ میں تو آپ آ سکتے ہیں ؟

ابوالکلام ۲۷ر جنوری ۲۰ئہ

مولانا اب رہائی پا کر کلکتہ پہنچ چکے ہیں -

مولانا محمد علی و شوکت علی کو بھی ۱۹۱۹ئہ کے آخر میں قید و بند سے رہائی مل گئی تھی - اور مولانا محمد علی نے جیل سے باہر آتے ہی اس وقت کے معیار سے تیز و تند تقریریں شروع کر دی تھیں -

(۱۲)

ری ٹریٹ -

شاہی باغ - احمد آباد

۲۹ر جون ۲۴ئہ

صدیقی العزیز! السلام علیکم

سفر سے واپس کلکتہ پہنچا تو آپ کا خط ملا لیکن ہجوم کار نے مہلت جواب نہ دی پھر دہلی اور احمد آباد کا سفر پیش آیا - ڈاک رکھ لی تھی کہ جہاں کہیں مہلت ملے گی جواب لکھوں گا امید ہے اس تاخیر کو معاف فرمائیں گے -

آپ نے مولوی طفیل احمد صاحب کی نسبت دریافت کیا ہے کہ میں نے ان سے جواز سود کے باب میں کوئی گفتگو کی ہے ؟ جہاں تک میرا حافظہ کام دیتا ہے مجھے یاد نہیں،

مولوی صاحب موصوف سے کبھی اس باب میں کوئی گفتگو ہوئی ہو بلکہ شاید ان سے ملاقات بھی کبھی نہیں ہوئی۔ میں نہیں کہہ سکتا کیوں انھیں ایسا خیال ہوا۔ غالباً اس بارے میں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ آپ نے ان کے نام کے ساتھ "صاحبِ جوازِ سود" لکھا ہے۔ کیا اس سے مقصود کوئی ان کی مصنفہ کتاب ہے؟

باقی رہا اصل مسئلہ تو جہاں تک قرآن اور اسلام کا تعلق ہے۔ نفس ربا کی حرمت میں تو گنجائش قیل وقال نہیں۔ فاذنوا بحرب من اللہ ورسولہ۔ البتہ ربا کے تعین و تشریح میں متعدد فقہی مباحث اور مذاہب و آراء ہیں۔ جنھیں فقہ و حدیث کی کتابوں میں دیکھا جا سکتا ہے، ہندوستان میں اوائل حکومت انگریزی سے ایک بحث یہ بھی شروع ہو گئی ہے کہ ہندوستان دار الحرب ہے یا دار الاسلام؟ اگر دار الحرب ہے تو فقہاء کا قاعدہ ہے۔ "لا ربا بین الحربی والمسلم" یعنی دار الحرب میں مسلمان اور حربیوں کی معاملت ربا نہیں ہے بعض کے نزدیک حربی کی قید بھی زائد ہے۔ پس اس بنا پر متعدد علماء کی رائے یہ رہی ہے کہ ہندوستان کی موجودہ پولیٹکل حالت میں مسلمان غیر مسلم سے سود لے سکتے ہیں مولوی عبد اللہ مرحوم ٹونکی اور مولانا شبلی مرحوم کی یہی رائے تھی۔ مولانا شبلی مرحوم نے اس پر ایک رسالہ بھی لکھا تھا اور ندوۃ العلماء کی کونسل کے علماء کے سامنے پیش کیا تھا غالباً ان کے مسودات میں ہوگا۔

پھر دار الحرب کے شروط میں بھی اختلاف ہے۔ حضرت امام ابو حنیفہ کی رائے دوسری ہے۔ صاحبین کی دوسری ہے۔ پھر بعض کے نزدیک ایک ملک دار الاسلام ہو کر دار الحرب ہو جا سکتا ہے۔ بعض کے نزدیک نہیں۔

حقیقت ان اختلافات سے بالاتر ہے اور دار الحرب میں جوازِ اخذِ سود کی جو تعلیل کی گئی ہے وہ بھی محل نظر ہے۔ صحیح تعلیل دوسری ہے۔ اگر ضرورت ہوئی اور مہلت ملی تو اس باب میں غور و خوض کیا جا سکتا ہے۔

ابو الکلام

ملک میں ترک موالات و خلافت وغیرہ تحریکات کا غلغلہ برپا ہے۔ بلکہ ابتدائی جوش اب دھیما پڑ چکا ہے۔ مولانا کا شمار اب آل انڈیا سیاسی لیڈروں میں ہے۔ اور

مسلسل سفر اور دورہ اس کا ایک لازمی نتیجہ تھا۔ اس افراطِ مشغولی کے باوجود، علمی بحثوں کے لیے بھی مولانا وقت و فرصت نکال لیتے ہیں۔

"جوازِ سود" مولوی سید طفیل احمد مرحوم کے ایک رسالہ کا نام تھا اللہ ان مرحوم کی لغزشیں معاف فرمائے، بیچارے کو دھن ہو گئی تھی مسلمانوں میں ترویج سود کی۔

(۱۳)

حبی فی اللہ! السلام علیکم

خط پہنچا، دہلی سے واپس آکر دو ہفتہ تک مبتلا بخار و پیچش رہا۔ اس وقت تک طبیعت بکلی صاف نہیں ہے۔ جہاں تک مسئلہ حجاز کا تعلق ہے جو کچھ ہو رہا ہے تمام تر افراط و تفریط ہے بڑی مصیبت یہ پیش آگئی ہے کہ مسئلہ دینی احکام و مصالح سے ممزوج ہو گیا ہے اور جو لوگ اس جھگڑے میں ہیں انہیں ان کی چونکہ خبر نہیں۔ ذاتی کاوشیں اور جماعت بندی کا جذبہ ایک مزید آفت ہے۔ مسئلہ پر آراء کی تقسیم حقیقت کی بنا پر نہیں بلکہ محض پارٹی کی بنا پر ہوتی ہے۔ مختلف حالات و اسباب ایسے ہیں کہ اصلاح حال کی امید بہت ہی کمزور ہے، الا یہ کہ اللہ تعالیٰ مقلب القلوب ہے۔

لکھنؤ میں جلسے کے موقعہ پر آنا ہی پڑے گا۔ اگرچہ سرے سے یہ جلسہ ہی بیکار ہے۔ ممکن ہے جلسہ کی تاریخیں بدل دی جائیں۔ لوگوں کو اعتراض ہے کہ دہلی میں جلسہ صرف اس لیے قرار دیا گیا تھا کہ رپورٹ وفد چھپ کر شائع ہو جائے اور ممبروں کو مطالعہ و نظر کا کافی وقت ملے۔ لیکن رپورٹ اس وقت تک تقسیم نہ ہو سکی غالباً آج بمبئی سے روانہ ہوئی ہو گی۔ میں نے شوکت صاحب کو لکھا ہے کہ جلسہ ۱۵ نومبر یا دسمبر کے پہلے ہفتہ میں منعقد ہو۔ غالباً ۱۵ نومبر قرار پائے۔ بہرحال امید ہے آپ سے جلد ملاقات ہو گی۔ قیام غالباً نواب علی حسن صاحب ہی کے یہاں ہو لیکن میں تو آپ کے یہاں ٹھہروں اگر آپ ٹھہرائیں۔

مولوی عبدالرزاق صاحب کا ادھر کئی ہفتہ سے کوئی خط نہیں آیا۔ مجھے ان کی صحت کی طرف سے برابر تشویش رہتی ہے۔ اگر ممکن ہو تو ملیے اور خط لکھنے کے لیے کہیے۔ مولوی

ظفر الملک صاحب ملیں تو سلام شوق۔

۲۶ ر اکتوبر ۲۶ء کلکتہ ابوالکلام

مولانا اس وقت تک آل انڈیا خلافت کمیٹی کے صدر تھے اور کمیٹی کے اندر مسئلہ حجاز کے باب میں ایک عجب خلفشار برپا ہو گیا تھا۔ علی برادران اور حضرات فرنگی محل و بدایوں وغیرہ سلطان عبدالعزیز بن سعود کے شدید مخالفوں میں ہو گئے تھے اور ظفر علی خاں صاحب اور اہل حدیث جماعت کے حضرات ان کے اسی شدید درجے میں حامی اور حمایتی تھے۔ مکتوب الیہ اودھ خلافت کمیٹی کا صدر تھا۔

جس جلسہ کا ذکر ہے وہ مرکزی خلافت کمیٹی کا ہو رہا تھا جس میں شدید جنگ اور زور آزمائی کا خطرہ تھا۔ رپورٹ سے مراد اس وفد خلافت کی رپورٹ ہے جو ۱۹۲۶ء میں حج کے موقعہ پر جا کر سلطان سے ملا تھا۔ اس کے ارکان مولانا سید سلیمان ندوی۔ مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی اور شعیب قریشی تھے۔

نواب علی حسن خاں (صفی الدولہ حسام الملک) مرحوم، مشہور اہل حدیث فاضل نواب صدیق حسن خاں قنوجی بھوپالی کے صاحبزادے خود بھی صاحبِ علم رئیس تھے۔ ندوہ اور مولانا شبلی کے شیدائی، کوٹھی بھوپال ہاؤس واقع لال باغ میں رہتے تھے۔

مولوی ظفر الملک اس وقت خلافت کے کارکن خصوصی تھے، مولانا نے از خود مکتوب الیہ کے ہاں قیام فرمانے کا ذکر فرمایا۔ یہ دلیل ان کے کمال شفقت و عنایت کی ہے۔

(۱۴)

حبی فی اللہ! السلام علیکم

ایک خط بھیج چکا ہوں۔ میں نے لکھا تھا شاید مجوزہ تاریخوں میں جلسہ کا انعقاد ملتوی ہو جائے۔ چنانچہ ملتوی کر دیا گیا ہے۔ اب دسمبر کے پہلے ہفتہ میں منعقد ہوگا۔ التوا کا باعث یہ ہوا کہ تقریباً ان ہی تاریخوں میں ہر جگہ کونسل کے انتخابات کی کشمکش درپیش ہے مرکزی کے ممبروں میں بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے، جو انتخابات میں مشغول ہیں خصوصاً بنگال اور پنجاب کے ممبر انھوں نے اعتراض کیا کہ ہماری شرکت ممکن نہیں۔ علاوہ بریں رپورٹ وفدِ حجاز کی

اشاعت میں بھی تاخیر ہوگئی - یہ تاخیر قصداً نہیں ہوئی - ناگزیر تھی - رپورٹ ضخیم ہے - باوجود سعی ۲۶ سے پہلے مکمل نہ ہوسکی - ایسی حالت میں یہی مناسب تھا کہ تاریخیں بدل دی جائیں۔ پیشتر ہی سے کافی نزاعات موجود ہیں - اب محض تاریخ انعقاد کا معاملہ مابہ النزاع کیوں بنا دیا جائے - نومبر میں انتخابات کی کش مکش ختم ہو جائے گی دسمبر کے پہلے ہفتہ میں بہ اطمینان جلسہ ہو سکے گا - آپ لوگوں نے لکھنؤ میں جلسہ کا اہتمام کیا تھا، ممکن ہے اس تاخیر کی وجہ سے کارکنوں کو بے لطفی ہو - لیکن امید ہے دسمبر کا اہتمام اس کی تلافی کر دے -

افسوس ہے کہ زمیندار اور ہمدرد کی نزاع کسی طرح ختم ہونے پر نہیں آتی - پچھلی دفعہ جب شروع ہوئی تھی تو میں نے بہت کوشش کی کہ سلسلہ آگے نہ بڑھے - مولوی ظفر علی خاں صاحب سے تو دہلی میں قول و قرار کرا لیا تھا کہ وہ مولانا محمد علی کے خلاف کچھ نہ لکھیں چنانچہ سلسلہ رک گیا تھا - مگر اب پھر شروع ہو گیا ہے - اور بڑھتا ہی جاتا ہے - نتیجہ یہ ہے کہ تحریک کا جو کچھ بھی رہا سہا اثر عوام میں باقی تھا وہ بھی امید نہیں کہ قائم رہ سکے - حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۲۰ء سے پہلے مسلمانانِ ہند میں جس قدر جماعتی قویٰ کا نظم اور دماغی انضمام تھا اتنا بھی اب نہیں ہے اور یہ نتیجہ ہے اس ردِ فعل کا جو ۱۹۲۰ء کی حرکت کے بعد ظہور میں آیا - اب مسلمانوں کی دماغی و اجتماعی تالیف و نظم کے لیے ازسرِنو دعوت و تحریک کی ضرورت ہے -

مولوی عبدالرزاق اور مولوی ظفر الملک صاحب ملیں تو سلام پہنچا دیں - آپ کے اخبار سچ کا اب کیا حال ہے؟ کتنی اشاعت ہے؟ ممکن ہو تو تفصیلات سے مطلع کریں -

کلکتہ - ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۶ء ابوالکلام

ہمدرد (دہلی) سے مراد مولانا محمد علی کا روزنامہ ہے اور زمیندار (لاہور) سے مراد مولانا ظفر علی خاں کا - وہی سعودی نزاعات دونوں میں زور شور سے جاری تھے -

سچ، صدق کا نقش اول تھا، اور اس وقت تک مولوی ظفر الملک کے اہتمام میں نکل رہا تھا -

مولوی عبدالرزاق ندوی ملیح آبادی تو مولانا کے سلسلے میں ایک معروف شخصیت

رکھنے والے تھے۔

(۱۵)

صدیقی!

آپ کا رجسٹرڈ خط دہلی سے واپس ہو کر یہاں ملا۔ سچ یہ ہے کہ آپ نے جس کتاب کا ذکر کیا ہے میری نظر سے نہیں گزری۔ آپ نے جو اقتباسات پیش کیے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کو تاریخ اسلام کے مبادیات تک معلوم نہیں، مجھے نہیں معلوم اس کے مترجم کون صاحب ہیں اور کیوں انھوں نے یہ کتاب ترجمہ کے لیے منتخب کی۔ اگر مقصود یہ تھا کہ ایک مخالف کا نقطۂ نظر واضح کیا جائے تو ضروری تھا کہ مقدمہ میں اس کی تصریح کی جاتی اور جابجا فٹ نوٹس بڑھائے جاتے۔ مصیبت یہ ہے کہ یا تو لوگوں کو کام کا شوق نہیں ہوتا، ہوتا ہے تو نظر واقتباز میسر نہیں۔ یورپ کی زبانوں خصوصاً جرمن میں اسلامی تاریخ و علوم کے متعلق مفید چیزیں موجود ہیں لیکن ہمارے نئے مترجموں کو صرف ایسی ہی کتابیں مل سکتی ہیں۔

لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا آپ نے اسے جامعہ کے کارنامہ سے کیوں تعبیر کیا۔ اس قسم کے اخبار نویسانہ مبالغوں سے بحث ونقد کی وقعت اور سنجیدگی کو صدمہ پہنچتا ہے۔ اگر جامعہ کے کسی پروفیسر نے ایک غلط کتاب ترجمہ کے لیے منتخب کی، یا اس کے نقد و تبصرہ میں کوتاہی کی، تو یہ اس کا ذاتی فعل ہے۔ بہ حیثیت ایک مترجم کے اسے مخاطب کرنا چاہیے۔ جامعہ کے کارناموں کا یہاں کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ابوالکلام

کلکتہ ۱۳ نومبر ۲۹ء

جس کتاب کا ذکر ہے وہ ہیل (Hell) کی کتاب کا ترجمہ تھا۔ جو "عربوں کا تمدن" کے عنوان سے جامعۂ ملیہ (دہلی) کے ایک استاد کے قلم سے اُردو میں شائع ہوا تھا۔ اور سچ نے اس پر شدید گرفت کی تھی۔

(۱۶)

۲۲ پرتھوی راج روڈ نئی دہلی

۱۱؍ فروری ۱۹۴۴ء

جناب محترم! تسلیم

آپ کا تحفہ حضرت مولانا کو پہنچ گیا۔ اس کے لیے وہ شکر گزار ہیں۔ مکتوب گرامی بھی موصول ہوا۔

ترجمان القرآن (جلد اوّل) زم زم کمپنی لمیٹڈ لاہور میں چھپ رہی ہے۔ وہ غالباً ہفتہ عشرہ میں پریس سے نکل جائے گی۔ امید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔

نیاز مند:

محمد اجمل خاں۔ سکریٹری مولانا آزاد

یقیناً میں نے اپنی کوئی کتاب تحفتہً پیش کی ہوگی اسی کا یہ جواب ہے اور مولانا کی تفسیر ترجمان القرآن کے بارے میں بھی ضرور دریافت کیا ہوگا۔

(۱۷)

آل انڈیا کانگریس کمیٹی

سوراج بھون۔ الہ آباد

۱۹؍ جولائی ۴۵ء

صدیقی!

شملہ سے واپس آکر یہاں کی ڈاک دیکھی تو آپ کا کارڈ ملا۔ ایک مدت کے بعد ایک عزیز کی صورت دیکھ کر جو خوشی ہوتی ہے، وہ آپ کا کارڈ دیکھ کر ہوئی۔ شکر گزار ہوں اور دُعا کرتا ہوں۔ والسلام علیکم۔

ابوالکلام

اب بالکل ذہن میں نہیں کہ اس کارڈ کا مضمون کیا تھا۔

(۱۸)

۱۹-اکبر روڈ، نئی دہلی
یکم اپریل ۴۸ء۱۹
جناب محترم! تسلیم

آپ کا خط حضرت مولانا کو ملا وہ فرماتے ہیں کہ ۵ ،اپریل کو آپ مندرجہ بالا پتے پر ½ ۱ بجے تشریف لائیں اور لنچ بھی نوش فرمائیں۔

راقم: محمد اجمل خاں

آل انڈیا ریڈیو کی مرکزی اُردو کمیٹی کا میں ممبر تھا اور اس کے جلسہ میں شرکت کے لیے ۵، اپریل ۴۸ء کو جانا ہو رہا تھا ــــ اجمل خاں صاحب کا دوسرا دستی احتیاطی خط ۵، اپریل کو کمیٹی کے عین دفتر میں بھی اسی مضمون کا موصول ہوا تھا۔

میں تو اپنی کتابیں مولانا ہی کی خدمت میں بھیجتا رہتا تھا۔اُدھر سے بھی ایک بار "غبار خاطر" کی جلد عنایت ہوئی۔ اس کے ساتھ کوئی عنایت نامہ بھی ضرور ہوگا۔لیکن وہ مجموعہ میں ملا نہیں۔

(۱۹)

۲۲، مئی ۴۸ء

صدیقی!

خط مورخہ ۱۷، مئی پہنچا۔ جس معاملہ کی نسبت آپ نے لکھا ہے وہ پیش نظر ہے۔ ہر بات اپنے مناسب وقت ہی پر انجام پا سکتی ہے اور انشاء اللہ انجام پائے گی۔

والسلام علیکم

ابوالکلام

اب مولانا وزیر تعلیمات سرکار ہند ہیں۔ غالباً ندوہ یا دارالمصنفین ایسے ہی کسی ادارے کی سرکاری امداد کی تحریک کی گئی تھی۔

مولانا کے ہاتھ کے لکھے ہوئے کل یہی ۱۷ خط محفوظ نکلے۔اس کے بعد کے کوئی ۳۰ خط اور بھی ہیں۔لیکن وہ سب مولانا کی طرف سے ان کے نج کے پرائیویٹ سکریٹری یا سرکاری پرسنل اسسٹنٹ کے ہاتھ کے یا اردو میں لکھے ہوئے یا انگریزی میں ٹائپ کیے ہوئے ہیں۔ اور وہ پبلک کے کام کے نہیں۔صرف دو چھوٹے سے

خط اس رنگ کے بھی بعض نمونہ کے طور پر خلاف ترتیب درج کیے جاتے ہیں۔

(۲۰)

(مولانا دریابادی نے انجمن طبیہ (یوپی) کے آل انڈیا طبیہ کنونشن (لکھنو) کے افتتاح کی مولانا سے درخواست کی تھی۔ اسی سلسلے میں حکیم مشتاق احمد بھی مولانا سے ملے تھے۔

۲۸ رجنوری ۱۹۵۳ء)۔

جناب محترم! تسلیم

آپ کا خط مولانا کو مل گیا تھا۔ حکیم مشتاق احمد صاحب بھی کنونشن کے سلسلے میں دہلی تشریف لائے تھے۔ مولانا کے لیے وقت نکالنا مشکل تھا۔ اس لیے انہوں نے معذرت کر دی تھی۔ آپ سے بھی وہ معذرت خواہ ہیں۔ اطلاعاً تحریر ہے۔

اجمل

(۲۱)

(مولانا دریابادی کا یہ خط مولانا کے نام نہیں، اجمل خاں کے نام تھا اور دریافت کیا تھا کہ کیا محکمہ اثریات (آرکیالوجی) کی انگریزی مطبوعات معارف (اعظم گڑھ) اور صدق جدید (لکھنو) کو تبصرے کے لیے نہیں بھیجی جا سکتیں؟)

۱۱ راکتوبر ۵۳ء

بہت ہی کم تعداد میں وہ چھپتی ہیں اور اخباروں کو نہیں بھیجی جاتیں۔

اجمل

(۲۲)

(ظفر احسن خاں کی کتاب "مآلِ مشیّت" دار المصنفین اعظم گڑھ نے چھاپی تھی۔ اس پر وزارتِ تعلیم نے پانچ ہزار روپے کا انعام دیا تھا۔ مولانا دریابادی نے مولانا کو اس کے لیے شکریے کا خط لکھا تھا۔ ۱۷ مارچ ۱۹۵۵ء)

مولانا فرماتے ہیں کہ آپ نے "مآلِ مشیّت" کے انتخاب کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان سے خوشی ہوئی بلاشبہ اس امتیاز میں مصنف کے ساتھ دار المصنفین کا

بھی حصّہ ہے، جس نے اسے شائع کیا۔

محمد اجمل خاں

(۲۳)

(مولانا کے کلام کے بارے میں دریافت کیا تھا۔)

۶ر فروری ۱۹۵۷ء

وہ کلام ضائع ہو گیا۔

اجمل

(۲۴)

جناب محترم! تسلیم

مولانا کو نسخہ مرسلہ پہنچ گیا[۱]۔ غالباً مولوی ابوالحسن علی صاحب نے صدق جدید ۲۸ر جنوری کا پرچہ مجھے بھیجا ہے اس کے آخری صفحے میں امام جماعت احمدیہ (ربوہ) کی تقریر سے یہ خبر نقل کی گئی ہے کہ "مولانا ابوالکلام صاحب جب جیل میں تھے تو حکومت نے انہیں صرف ایک اخبار منگانے کی اجازت دی۔ انہوں نے الفضل کے متعلق کہا کہ میرے لیے الفضل منگانے کا انتظام کیا جائے"۔ یہ پڑھ کر میں نے مولانا سے حقیقت حال دریافت کی انہوں نے فرمایا کہ "عمر بھر میں کبھی ایسے اخبار کا جس کا نام الفضل ہو پڑھنے والا نہیں رہا ہوں[۲]" اور یہ واقعہ بھی

---

[۱] مولانا دریابادی نے اپنی تصنیف "اکبر نامہ" مولانا آزاد کی خدمت میں بھیجی تھی۔ [۲] یہ بات ۲۸ دسمبر ۵۶ء کو ربوہ کے سالانہ جلسے میں تقریر کرتے ہوئے کہی گئی تھی اور الفضل ہی کے حوالے سے صدق جدید نے نقل کی تھی اس بیان کا آخری جملہ یہ تھا:

"واقعات بتاتے ہیں کہ اگر اخبار کو دلچسپ اور مفید بنانے کی کوشش کی جائے تو اس کی نہ صرف اپنوں میں بلکہ غیروں میں بھی کتنی اشاعت ہو سکتی ہے"۔

الفضل کے لیے یہ بیان اس لیے بھی دلچسپی کا باعث بنا کہ ایک غیر شخص بھی اس کے مطالعے کا شائق تھا مولانا دریابادی کے پیش نظر صرف روایت کی تحقیق ہی نہ تھی بلکہ معاصر موصوف کے لیے "شرف و فضل" کی آرزو بھی تھی۔ چنانچہ مذکورہ روایت کو نقل کر دینے کے بعد لکھتے ہیں:

(بقیہ صفحۂ آئندہ)

سرے سے غلط ہے کہ جیل میں انہیں صرف ایک اخبار منگوانے کی اجازت دی گئی۔ مولانا نے فرمایا جب میں رانچی میں نظر بند تھا تو ۵، ۶ انگریزی روزانہ اخبار میرے پاس آتے تھے۔ علی پور سنٹرل جیل کلکتہ میں گورنمنٹ کی طرف سے "اسٹیٹس مین" مجھے ملتا تھا۔ اور "امرت بازار پتر کا" اور "سرونٹ" میں خود منگواتا تھا۔ احمد نگر قلعے میں ابتداء میں بندش رہی۔ اس کے بعد جب بندش دُور ہو گئی تو جتنے اخبار ہم چاہتے تھے وہ برابر ہمارے پاس آتے تھے۔ علاوہ بریں جیل میں مطالعے کے لیے ضرورت ہوتی ہے کہ روزانہ اخبارات کا مطالعہ کیا جائے۔ وہاں اردو کے ایک ہفتے وار یا ماہوار مذہبی رسالے کے منگوانے کا وہم وگمان بھی کسی کو نہیں ہو سکتا اور وہ بھی قادیان کا۔ معلوم نہیں "الفضل" ماہوار ہے یا ہفتے وار لیکن بہر حال روزانہ نہیں ہو سکتا ہے۔

افسوس ہے کہ ایک صاحب جو اپنے آپ کو اپنی جماعت کا امیر قرار دیتے ہیں۔ ایسی غلط اور بے پر کی بات اپنی تقریر میں کہتے ہیں۔

محمد اجمل خاں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

روایت عجیب جتنی بھی ہو، اگر اس کی تفصیلات معلوم ہو جائیں کہ یہ کس زمانے کا ذکر ہے، مولانا اس وقت کس جیل میں تھے؟ اور یہ روایت آیا خود مولانا کی بیان کی ہوئی ہے یا کسی اور کی؟ وغیرہا۔ تو یقیناً اس سے معاصر موصوف کو شرف و فضل کی ایک سند ہاتھ آجائے گی مولانا جیسے صاحب ذوق و صاحب نظر کے انتخابات میں آجانا کوئی بہت معمولی سی بات نہیں۔"

(صدق جدید، لکھنؤ، ۲۸ جنوری ۵۵ء ص ۲+۸)

اب جو مولانا دریا بادی کا مولانا کے نام خط پہنچا تو مناسب معلوم ہوا کہ اس بے اصل روایت کی حقیقت بیان اور مولانا دریا بادی کی غلط فہمی دور کر دی جائے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا اسی زمانے میں مولانا آزاد کے نام خط اور اس روایت کا تراشہ اس ضروری تردید کے لیے تحریک بن گیا۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کے خطوط

مولانا ابوالکلام آزادؔ کے نام

مولانا دریابادی کے یہ خطوط "مولانا ابوالکلام آزاد کے نام ادبی خطوط و جواباتِ آزاد" مطبوعہ دہلی، ۱۹۶۶ء سے ماخوذ ہیں۔

(۱) دریا باد۔ ضلع بارہ بنکی

۲۸، جنوری ۱۹۴۳ء

مخدوم مکرم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

انجمن طبیہ، یوپی ایک بڑے پیمانے پر آل انڈیا طبیہ کنونشن لکھنؤ میں دارالعلوم ندوہ کی عمارت میں ۲۲، فروری (یک شنبہ) کو منعقد کر رہی ہے۔ صدر، صوبہ کے وزیرِ صحت، سی، پی گپتا صاحب ہوں گے۔ اور صدرِ استقبالیہ حکیم ڈاکٹر عبدالعلی ندوی (ابن حکیم عبدالحی صاحب مرحوم ناظم ندوہ) منتخب ہوئے ہیں۔

ارکان انجمن کی بڑی خواہش ہے کہ کنونشن کا افتتاح اگر جناب کی ذاتِ گرامی سے ہو سکے تو:

کلاہِ گوشۂ دہقاں بہ آفتاب رسد

جناب کی مصروفیت اور کم فرصتی ظاہر ہے۔ پھر بھی اِن حضرات کا اصرار یہی ہے اور علوم مشرقی سے جناب کو جو نسبت ہے وہ بھی بالکل ظاہر ہے۔

ان حضرات کا ایک عجیب حسنِ ظن اس گوشہ نشین سے متعلق یہ ہے کہ اس کا معروضہ شرف پذیرائی کا بہت کچھ امکان رکھتا ہے۔ ان کے ارشاد کی تعمیل میں اس عریضہ نگاری کی جرأت کر رہا ہوں۔

والسلام

دعاگو و نیاز کیش قدیم: عبدالماجد

(۲)

دریاباد - بارہ بنکی

۸ر اکتوبر ۱۹۵۳ء

کرم گستر! السلام علیکم

کئی دن ہوئے، یہ خیال آیا کہ محکمہ اثریات (آرکیالوجی) بھی تو مولانا ہی کے ما تحت ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اس کی مطبوعاتِ انگریزی، تبصرہ و تعارف کے لیے صدق و معارف کو موصول ہو سکیں؟

اگر گنجائش ہو تو مولانا کی خدمت میں یہ نیاز نامہ پیش کر کے منظوری حاصل کر لیں۔ صدق کی ادارت کے ساتھ معارف کے ایڈیٹوریل بورڈ کی صدارت بھی اسی خاکسار کے سپرد ہے۔ دونوں کا پیاں یہیں روانہ فرمائی جا سکتی ہیں۔ میرا مستقل قیام، "دریاباد (ضلع بارہ بنکی)" میں رہتا ہے۔ اعظم گڑھ وقتاً فوقتاً ہو آتا ہوں۔

ایک ادنیٰ سی بات کے لیے براہ راست مولانا کو لکھنا مناسب نہ معلوم ہوا۔

والسلام، دعاگو:

عبدالماجد

(۳)

دریاباد - ضلع بارہ بنکی

۱۵ر جنوری ۵۵ء

بسم اللہ

مخدوم و محترم!   السلام علیکم و رحمۃ اللہ

اپنی حقیر تالیف "اکبر نامہ" کا ایک نسخہ پرسوں ارسالِ خدمت کیا ہے۔ امید ہے کہ اللہ کے فضل سے آں محترم ہر طرح بخیر ہوں گے۔

والسلام، دعاگو:

عبدالماجد

(۴)

دریاباد ۔ ضلع بارہ بنکی

۱۷ر مارچ ۵۵ء

مخدوم و محترم ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

ظفر حسین خاں صاحب کی کتاب "مال و مشیئت" پر جو ۵ ہزار کی گراں قدر رقم کا انعام عطا فرمایا گیا ۔ اس پر اپنی دلی داد اور مخلصانہ مبارک باد پیش کرتا ہوں ۔

کتاب بجائے خود اچھی اور فلمی و افسانوی ہونے کے بجائے علمی ، سنجیدہ اور حکیمانہ ، مذہب و اخلاق کا نمونہ ، پھر مصنف میرے ایک قدیم ترین مخلص اور کالج کے ساتھی ۔ اور آخر میں یہ کتاب یکے از مطبوعات دار المصنفین (ادارۂ مذکور کی خدمت کا شرف سید صاحب مرحوم و مغفور کے بعد اب اس بے علم ہی کو حاصل ہے) ۔

ایسی قدردانی تقریباً محال تھی اگر وزارت تعلیم کے عہدے پہ آج کوئی اور ہوتا ۔

والسلام ، دعاگو :

عبدالماجد

(۵)

دریاباد ۔ ضلع بارہ بنکی

۳۰ر اگست ۱۹۵۵ء بسم اللہ

...

والا مناقب ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ ۔

اپنی چھوٹی سی ایک تازہ کتاب "حیوانات قرآنی" لکھنؤ سے خدمتِ والا میں روانہ کر دی ہے ۔ خدا کرے آپ کو اس پر ایک سرسری نظر ڈالنے کا وقت بھی مل جائے ؎

زکدام رہ بیایم کہ بہ چشم تو در آیم

کہ بہ گرد چشم مستت ہمہ نیزہ سپاہ است

والسلام ، دعاگو :

عبدالماجد

(۶)

دریاباد - ضلع بارہ بنکی

۱۷ ر اکتوبر ۱۹۵۵ء - بسملہ -

مخدوم و مکرم ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

کئی ہفتہ ہوئے اپنا رسالہ "الحیوانات فی القرآن" حاضر خدمت کیا تھا - آپ کے معمولات کریمہ کے مطابق رسید ادھر سے ضرور عنایت ہوئی ہوگی - مجھے وصول نہ ہو سکی -

اب اپنی مرتبہ شرحِ مناجاتِ مقبول ارسالِ خدمت کی ہے - اس وقت پہنچ چکی ہوگی - خدا کا فضل ہے - امید ہے کہ آپ ہر طرح بہ عافیت ہوں گے -

والسلام، دعاگو :

عبدالماجد

(۷)

دریاباد - ضلع بارہ بنکی

۲ ر فروری ۱۹۵۷ء بسم اللہ -

مخدوم مکرم ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اگر یہ زحمت دیں خصوصًا الیکشن کی مصروفیت کے زمانے میں بالکل ہی بے موقع نہ ہو تو یہ ذرا دریافت کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ عمر کے کسی دور میں آں مخدوم نے شعر گوئی پر بھی توجہ فرمائی ہے ؟

اگر جواب اثبات میں ہے تو اب وہ کلام کہاں ہے اور کیونکر حاصل ہو سکے گا ؟

والسلام، دعاگو :

عبدالماجد -

سر سیّد کی کہانی
ان کی اپنی زبانی!
مسلمانانِ ہند کی تاریخ میں مذہب، سیاست،
تعلیم اور زبان کے سب سے بڑے محسن کی
خود کشیدہ تصویر
الطاف حسین حالی کی روایت کے مطابق
سر سیّد کے اعترافات
ضیاء الدین لاہوری کی محققانہ تالیف جسے ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری کے طویل مقدمہ نے
سہ آتشہ بنا دیا ہے:
آپ اس انتخابِ شیریں کی لذت کو مدت دراز تک
فراموش نہ کر سکیں گے!
طباعت آفسٹ
جلد خوبصورت
صفحات ۱۱۲
قیمت ۱۵ روپے
ادارہ
تصنیف و تحقیق
پاکستان
۱۸.۸۶ کراچی ۳۲

علامہ اقبال کی شاعری اور سیاسی افکار پر انکے اولین نقاد مولانا محمد علی کی ایک نایاب تحریر

علامہ اقبال اور مولانا محمد علی

مؤلفہ

ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری

حضرت علامہ کی شاعری انکے ملی پیغام انکے سیاسی فکر اور سیرت کا
دلاویز مرقع

۱۹۲۷ کے ہمدرد دہلی سے ماخوذ ایک طویل مقالہ

نیز

ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری کے قلم سے

ہر دو اکابر کے تعلقات کے نشیب و فراز کی داستان اور افکار و سیرت کا تقابلی مطالعہ

مولانا محمد علی کی شخصیت مزاج اور انکے فکر و انشا کا تنقیدی تجزیہ

شخصیت کی عظمت سیرت کے محاسن اور خدمات کی جلالت کے حسن اعتراف کا ایک اچھوتا انداز

کاغذ سفید کتابت و طباعت اچھی قیمت ۲۰ روپے (پیپر بیک)

۲۵ روپے مجلد

ملنے کا پتہ

ادارۂ تصنیف و تحقیق پاکستان

علی گڑھ کالونی کراچی ۱۹

پروگرام

مطبوعاتِ آزاد صدی

آزاد نیشنل کمیٹی پاکستان نے حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کے صد سالہ یوم پیدایش یعنی آزاد صدی کی تقریب سے جو یادگار پروگرام بنایا ہے اس کا خاص حصہ کتابوں کی اشاعت سے متعلق ہے۔ یہاں چند کتابوں کا مختصر تعارف کرایا جا رہا ہے جو شائع ہونگی۔ واضح ہے کہ یہ تمام کتابیں مختلف اہل علم کی تصنیف و تالیف اور مختلف اداروں کی مطبوعات میں شمار ہوں گی ان میں سے بعض کی اشاعت یا تالیف و تدریس میں کمیٹی کا صرف ایما، یا اخلاقی یا علمی تعاون شامل ہوگا۔

☆

اُردو کا عظم
ادیبِ اعظم

مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق مولانا عبدالماجد دریابادی کے مضمون، تقریریں، شذرات و دیگر تحریرات

مولانا ابوالکلام آزادؒ (شخصی مطالعہ)

از

ڈاکٹر شیر بہادر خان پنّی

مولانا آزاد کی شخصیت، سیرت اور افکار کا مطالعہ

امام الہند مولانا آزاد

از

مولانا امداد صابری

مولانا ابوالکلام آزاد کے سوانح و افکار، شخصیت و سیرت اور خدمات کا تذکرہ!

مولانا آزاد اور اُن کے معاصر
(افکار و تعلقات)

سرسید احمد خان، علامہ شبلی، نواب صدر یار جنگ، حبیب الرحمن خان شروانی، علامہ اقبال، سر عبدالقادر، مولانا عبیداللہ سندھی، بابائے اردو مولوی عبدالحق، مولانا سید سلیمان ندوی اور کئی دیگر اکابر و مشاہیر

مولانا ابوالکلام آزادؒ
(دیدو شنید)

پاکستان کے نامور اہلِ علم و اصحابِ فکر کے مضامین کا ایک نادر مجموعہ مضامین، چند لکھنے والے: چراغ حسن حسرت، حکیم احمد شجاع، حاجی لق لق، عبدالمجید سالک، مولانا غلام رسول مہر، عبداللہ بٹ، ملا واحدی، ضیاء الدین برنی، پروفیسر محمد سرور، شورش کاشمیری، رئیس احمد جعفری، انجم فوقی بدایونی، ڈاکٹر عبادت بریلوی، پروفیسر محمد باقر، ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، میرزا ادیب، ڈاکٹر شیر بہادر خان پنی، عبدالمنان شاہد وغیرہ۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ
مطالعہ کی روشنی میں

مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت، سیرت، اور خدمات کے مختلف پہلوؤں پر ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری کے مقالات

یگانۂ روزگار
از
ڈاکٹر ریاض الرحمٰن خاں شروانی

مولانا ابوالکلام آزاد سے ملاقاتوں کے تاثرات، مطالعے کے ثمرات، افکار و خدمات کے تذکار اور مولاناؒ کے اندوہناک حادثۂ انتقال اور ان کے ماتم کے حالات میں مقالات کا مجموعہ۔ نصف صدی کے مشاہدے اور مطالعے کی داستان

مولانا ابوالکلام آزادؒ
(یک جہانِ علم و فضل)
از
مولانا محمد شعیب عمری

مولانا آزاد کے علمی مقام اور دینی زندگی کے علمی و عملی پہلوؤں پر فاضل محقق کے معلومات افزا رشحاتِ قلم اور تحقیقات

مولانا ابوالکلام آزادؒ
اہل حدیث ارباب علم کی نظر میں!

فاضل مرتب، پروفیسر محمد یامین محمدی، چند لکھنے والے: مولانا نصراللہ خان عزیز، مولانا غلام رسول مہر، عبداللہ بٹ، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مسعود عالم ندوی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا محمد حنیف ندوی اور دیگر اہل قلم

علامہ اقبال اور مولانا آزادؒ

ذہنی و فکری کمالات، علمی، مذہبی اور فلسفیانہ افکار اور شخصیت و سیرت کا تقابلی مطالعہ، لکھنے والے مولانا غلام رسول مہر، عتیق صدیقی، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر ریاض الرحمن شروانی، پروفیسر قاضی فضل حق قریشی اور دیگر حضرات

ہندوستان میں ابن تیمیہؒ (شورش کاشمیری)

مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق شورش کاشمیری کے مضامین، خطوط، مباحثے، سفرنامے اور شورش مرحوم کے نام متعدد مشاہیر علم و ادب کے خطوط!

مولانا ابوالکلام آزاد (شخصیت اور فن)

مولانا آزاد کی شخصیت اور فکر و فن کے خصائص و محاسن، خطابت کے کمالات اور ادب و صحافت، مذہب و سیاست، تعلیم و فلسفہ میں مولانا کے افکار و خدمات

پاک و ہند کے اکابر اہل علم کے تحقیقی و تنقیدی مقالات کا مجموعہ

ابوالکلام و عبدالماجد (ادبی معرکہ)

اصطلاحات و لغات کے باب میں مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبدالماجد دریابادی کے افکار و افادات، مباحثے کی تفصیل اور تنقیدی تجزیہ

مولانا آزاد اور اُن کی صحافت (ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری)

لسان الصدق، الہلال، البلاغ، پیغام (کلکتہ)، کے مکمل اشاریے، الندوہ (لکھنؤ) کے دورِ ادارت میں نیز البیان (عربی) اور متفرق رسائل میں مولانا آزاد کے مضامین کے اشاریوں کے علاوہ حضرت مولانا کے رسائل کے اجراء کی تاریخ، مقاصد و خصائص کی تشریح اور ان رسائل کی علمی، ادبی، مذہبی، سیاسی خدمات، الہلال کے ارکانِ ادارہ اور صاحب الہلال کے عظیم الشان کارنامہ صحافت کا تعارف

مولانا ابوالکلام آزاد کی یاد میں

* **حضرت شیخ الہند کی سیاسی خدمات** — مولانا سعید الرحمن علوی

ملک اور قوم کی آزادی کی جنگ اور ملتِ اسلامیہ پاک و ہند کی تعمیر اور ترقی کے حفظ و بقا میں زبدۂ اصحابِ عزم امور اور سرخیل اربابِ عزیمت و دعوت حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کی عظیم الشان خدمات اور افکار کا دلآویز تذکرہ!

* **تحریکِ خلافت اور ترکِ موالات** (ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری)

* **خطوطِ ماجدی** — مولانا عبدالماجد دریابادی کے علمی، ادبی، لسانی ورنج کے خطوط

وغیرہ وغیرہ

مولانا ابوالکلام آزاد کے رشحاتِ فکر و قلم

البلاغ کلکتہ

مولانا ابوالکلام آزاد کے ہفت وار البلاغ ۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء - ۳۱ مارچ ۱۹۱۶ء کی عکسی اشاعت

لسان الصدق کلکتہ

مولانا ابوالکلام آزاد کے ماہنامہ "لسان الصدق" نومبر ۱۹۰۳ء - مئی ۱۹۰۵ء کی عکسی اشاعت

الندوہ لکھنؤ

الندوہ میں مولانا آزاد کے دورِ ادارت ۶-۱۹۰۵ء میں اور اس کے بعد شائع شدہ تحریرات کی عکسی اشاعت

تحریکِ آزادی

تحریکِ آزادی اور مسلمانوں سے متعلق مولانا آزاد کے مضامین کا مجموعہ

سلسلۂ مجلدات

مضامینِ الہلال و البلاغ

الہلال اور البلاغ میں شائع شدہ حضرت مولانا آزاد کی تحریرات پر مشتمل سلسلہ

کئی جلدوں میں